رجسٹرڈ نمبر اے ۲۵۱

اردوئے معلی

نمبر ۴	اکتوبر ۱۹۰۴ء	جلد ۳

مرتبہ سید فضل الحسن حسرت موہانی - بی - اے

فہرست مضامین

مقام اشاعت دفتر اردوئے معلی - علیگڈھ

باہتمام خاکسار سعید احمد

مطبع احمدی علی گڈھ میں طبع ہوا

زمانہ

ایک اعلیٰ درجہ کا ماہوار رسالہ

جس میں

ہر ماہ مشاہیر ملک میں سے کسی نہ کسی کی عکسی تصویر نذرِ ناظرین کیجاتی ہے

اور جسکو

باعتبار حجم، ترتیب، قیمت وغیرہ ملک کے کثیر اخباروں اور اہل الرائے اصحاب نے اردو کے موجودہ رسالوں میں بہت قابل قدر بتلایا ہے۔ قیمت سالانہ عہ ششماہی عہ علاوہ محصولڈاک۔ پیشگی یا بذریعۂ ویلیو پی ایبل۔

فہرست مضامین زمانہ بابت جولائی و اگست سنہ ۱۹۰۴ء

قیمت	حجم رسالہ زمانہ بابت جولائی و اگست سنہ ۱۹۰۴ء ۱۰۴ صفحات علاوہ سرورق و اشتہارات

نوٹ زمانہ کے جنوری سے جون سنہ ۱۹۰۴ء تک کی ششماہی جلد جسکے قابلِ دید مضامین نظم و نثر ۴۹۶ صفحات پر آئے ہیں علاوہ واشتہارات اور جسمیں سر سید احمد خاں اور پنڈت رتن ناتھ سرشار و مسٹر تلک کی تین نہایت عمدہ عکسی تصاویر ہیں عہ میں بلا جلد اور عہ میں مع جلد دفتر ہذا سے مل سکتی ہے صرف چند جلدیں باقی ہیں۔ شائقین جلد طلب فرمائیں محض تصویریں ۳ فی تصویر کے حساب سے مل سکتی ہیں

منیجر زمانہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرۃ الشعرا

شیفتہ

نواب محمد مصطفیٰ خاں نام شیفتہ تخلص خلف ارشد عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر مظفر جنگ۔ خاندانِ دہلی سے تھے۔ اردو میں استاد الاساتذہ حکیم مومن خاں مرحوم سے تلمذ تھا اور فارسی میں مرزا نوشہ سے مشورہ کرتے تھے۔

شعرائے دہلی کے قدیم انداز کی لطفیں جیسی انکے کلام میں پائی جاتی ہیں ویسی انکے معاصرین میں سے کسی کو نصیب نہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ اس باکمال کے ساتھ دہلی کے قدیم طرزِ سخن کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اسکی ایک خاص وجہ تھی۔ یعنی یہ کہ شیفتہ کے بعد، باشندگانِ دہلی سے علوم و فنون کا چرچا جاتا رہا۔ یہانتک کہ وہ فارسی سے بھی بیگانہ ہوتے گئے اور اسلئے میر و مرزا غالب و مومن کا رنگ، جسکے مضمون کی بلندی، الفاظ کی متانت ترکیب

کی خوبی، اعلیٰ درجے کے صحیح مذاق اور استعداد سے تعلق رکھتی ہے اُنکے قبضے سے نکل گیا۔ چنانچہ آجکل مشاہیر شعراے دہلی کا کلام صرف خوبی زبان اور بے تکلفی کی بنا پر شہرت رکھتا ہے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بیان تھا اب شیفتہ کے مذاقِ سخن کی کیفیت سنئے کہ تمام علوم رسمی اور فنون متد اولہ سے آشنا تھے۔ اسپر طرہ یہ تھا کہ صحبت ان لوگوں کی پائی تھی جنکے نام کے ساتھ کمالِ سخن کا ذکر ہمیشہ وابستہ رہیگا۔ یعنی غالب و مومن و آزردہ۔ جن میں سے ہر ایک یادگارِ زمانہ تھا۔

اساتذہ قدیم کی یہ ایک خاص روش تھی کہ دیوان ریختہ کے ساتھ دیوان فارسی اور بعض صورتوں میں تذکرۂ شعرا بھی ضرور لکھتے تھے گویا اُنکے نزدیک حصول پایۂ اُستادی کا یہی ثبوت ہوتا تھا۔

میر و مرزا سے لیکر غالب و مومن تک اکثر شعرا نے اُس خصوصیت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اور شیفتہ نے بھی اسکو ہاتھ سے جانے ندیا۔ چنانچہ اردو دیوان کے علاوہ انکا فارسی دیوان اور تذکرۂ شعرا (گلشنِ بیخار) بھی مقبول اہلِ نظر ہے۔

فارسی میں حسرتیؔ تخلص کرتے تھے اور ایک اندازِ خاص کے مالک تھے اُن کی ایک فارسی غزل ہے۔

رحمے بکس نخوردہ و مرہوں نکردہ کس	در شہر کس نماندہ کہ مفتوں نکردہ کس
و ز ز و صلاے جلوہ و خلقے برشک سوخت	دستِ کرم کشادہ و ممنوں نکردہ کس
گر غیر و رشکِ غیر بروں کردہ باش	از دل خیالِ بزم تو بیروں نکردہ کس
زیں غم کہ سازِ مے گلرنگ نشکند	بادے حکایتِ دلِ پُرخوں نکردہ کس

اے حسرتیؔ مپرس ز غالب کہ از غزل
آں کار میکند کہ بافسوں نکردہ کس

مرزا غالب، کہ نظیری و حزیں کے سوا فارسی میں عرفی کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے اور کہتے تھے کہ۔ ع

عرفی کسے ست لیک نہ چوں من دریں بحث

وہ بہی حسرتی کے فارسی کلام کی نسبت اسی ردیف وقافئیے میں اپنی ایک غزل کے مقطع میں لکھتے ہیں۔ ؎

غالب زحسرتی چہ سرائی کہ در غزل
چوں او تلاش معنی ومضموں نکردہ کس

مرزا کے اس قول، نیز مندرجۂ بالا غزل سے اہل بینش دریافت کر سکتے ہیں کہ شیفتہ کا پایۂ سخن فارسی میں معمول سے کسقدر زیادہ بلند ہے۔

خود چونکہ ذی استعداد وصاحب مذاق صحیح تھے اسوجہ سے گلشن بیخار میں، دوسرے تذکرہ نویسوں کے برخلاف، اکثر شعرا کے کلام پر تنقید منصفانہ سے باز نہیں رہے ہیں۔ اگر زمانۂ موجودہ کے مذاق کے مطابق دیکھئے تو شیفتہ نے جسقدر تنقید کی ہے وہ بہی ناکافی نظر آتی ہیں لیکن پہر بہی اس بارے میں اُنکی تحریر قابل ستایش ہے کیونکہ اُنسے قبل اور انکے معاصرین بعض ایسے تذکرہ نویس بہی گذرے ہیں جنہوں نے رجحان مروج کے اصول کے مطابق جتنے شاعروں کا حال لکہا ہے سب کی یکساں تعریف کی ہے، اور اسلئے اُنکے تذکرونکو تذکرہ کہنا ہی ایک معنی کرکے غلط ہے۔

لوگ چونکہ اس قسم کی نکتہ چینیوں کے عادی نہ تہے اسلئے شیفتہ کی صاف گوئی بہتوں کو ناگوار گذری۔ مثلاً میر قطب الدین باطن اکبرآبادی کو کہ نظیر اکبرآبادی کے شاگرد تہے اپنے اُستاد کی نسبت شیفتہ کا بیان اسقدر ناگوار گذرا کہ محض اسکے جواب اور رد کے لئے ایک نیا تذکرہ گلستان بیخزاں کے نام سے لکہا۔ اور اُس میں یہ التزام کیا کہ جن شاعروں کی شیفتہ نے تعریف کی تہی اُنکی ہجو اور جن کی برائی کی تہی اُنکی حد سے زیادہ تعریف کی۔

یا مثلاً آزاد نے تذکرہ آب حیات میں سید انشا کی مدح بیجا کے جوش میں شیفتہ کے صحیح اور بالکل صحیح اعتراض پر اظہار ناراضی کیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ کم از کم انشا کے معاملے میں شیفتہ کا قول صحت سے نزدیک تر ہے۔

سید انشا کی نسبت لکہا ہے "دیوانے وارد مشتمل بر اصناف سخن وہیچ صنف را بطرز نقد

"اسخن شعر شگفتہ۔ اما در شوخی طبع وجودت ذہن او شکے نیست"

ارباب انصاف دیکھیں کہ اس میں کوئی بات نامناسب نہیں درج کی ہے۔ انشا کی شوخی طبع اور جودت ذہن کو تسلیم کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اسکے کلام انشا پر یہ بجا حکم لگاتا ہے کہ وہ قابل اعتبار نہیں ہے مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ انشا ہزل گوئی پر مجبور تھی کیونکہ دربار لکھنو کا رنگ ہی ایسا واقع ہوا تھا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب کسی شاعر کے کلام پر حکم لگایا جاتا ہے تو اس کی موجودہ حالت پر لگایا جاتا ہے نہ کہ ممکنات پر۔ بحالت موجودہ چونکہ انشا کا کلام پایۂ اعتبار سے ساقط ہے اسلئے ہر بے لاگ تذکرہ نویس شیفتہ کی راے سے اتفاق کریگا۔

نظیر اکبر آبادی کے ذکر میں البتہ شیفتہ کی نکتہ چینی حد سے گذر گئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے نظیر کی صرف چند بازاری نظمیں مثلاً چوہونکا آچار وغیرہ سنکر یہ راے قائم کرلی ہوگی۔ اگر نظیر کی تمام نظمیں انکی نظر سے گذرتیں تو غالباً اسقدر درشتی کو کام نہ فرماتے۔ بہرحال گلشن بیخار اگرچہ کمزوریوں سے خالی نہیں ہے لیکن اس زمانے کے دوسرے تذکروں کے مقابلے میں بہت غنیمت ہے۔

وہ جو ہمنے پہلے بیان کیا ہے کہ شیفتہ دہلی کے قدیم طرز سخن کے خاتم تھے اسکا ثبوت انکے دیوان ریختہ سے بھی ملتا ہے۔

مرزا نسیم مرحوم بھی مومن کے شاگرد تھے لیکن قیام لکھنؤ کے اثر سے بعض قدیم الفاظ کے استعمال سے انہوں نے قطعاً پرہیز کیا ہے۔ لیکن شیفتہ اپنے رنگ میں اسقدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ انکو ان حقیقت یا تو نکا خیال ہی نہیں رہتا بے تکلف لکھتے ہیں۔ سہ

کیا اٹھ گیا ہے دیدۂ اغیار سے حجاب
ٹپکا پڑے ہے کیوں نگہ یار سے حجاب

خیر یہ تو الفاظ کا ذکر تھا۔ بندش الفاظ اور روشش ترکیب کو ملاحظہ فرمایئے کہ شیفتہ دہی کتا ہے جو مومن خاں نے کہا یا جیسا کہ غالب کے قلم سے نکلا انکا ایک مطلع ہے سہ

اثر آہ دل زار کی افواہیں ہیں	یعنی مجھپر کرم یار کی افواہیں ہیں

یہاں پر دیکھنے والے دیکھیں کہ "یعنی" نے خوبیِ شعر کی ترقی میں کیا کام کیا ہے۔
بیان کا یہ انداز کہ پہلے مصرعے میں ایک بات کہی اور دوسرے مصرعے میں "یعنی" کیساتھ اس کی تشریح کر دی خاص مومن و غالب کا حصہ ہے۔
ایک اور مطلع ہے۔ ؎

بچتے ہیں اسقدر جو اوپر کی ہوا سے ہم
واقف ہیں شیوۂ دلِ شورش ادا سے ہم

دلِ شورش ادا کی ترکیب اور پھر شیوۂ دلِ شورش ادا کی ترکیب خاندانِ مومن کے لئے مخصوص ہے۔
طرزِ مومن کے ضمن بیان میں شیفتہ کے اور بھی دو چار شعر ملاحظہ طلب ہیں لکھتے ہیں

؎

سب حوصلہ جو صرف ہوا جورِ یار کا
مجھ پر گلہ رہا ستمِ روزگار کا

دیگر

میں وصل میں بھی شیفتہ حسرت طلب رہا | گستاخیوں میں بھی مجھے پاسِ ادب رہا

دیگر

کس چین سے نظارہ کہ ہر دم ہو تیتر | دل کو چۂ دشمن میں بہل جائے تو اچھا

دیگر

یہاں کے آنے میں نہیں انکو تو تمکین کا خیال | غالباً کچھ تو ہوا ہے مری تسکیں کا خیال

دیگر

گر جیسے خفا وہ ہیں گئے گذشتے خفا ہم | مدت سے اسی طرح نبھے جاتی ہے باہم

ے

نکونا غیر کے گھر کا ارادہ تم کہ مدت سے — تجسس میں فغانِ شوق کے تاثیر پھرتی ہے
نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن — کبھی دلمیں ہوا ئے شیوہائے میر پھرتی ہے

اس آخری مقطع میں انداز میر کی نسبت جو خیال شیفتہ نے ظاہر کیا ہے وہ بھی بلا وجہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے۔ مومن و غالب کی خصوصیت ترکیب سے قطع نظر کر کے انکے بعض اشعار کی سادگی مضمون کو ملاحظہ فرمائیے تو عموماً ان میں صاف میر کا رنگ جھلکتا نظر آئیگا۔

مثلاً مومن کہتا ہے۔ ے

حال دل یار کو لکھوں کیونکر — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
تم میرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یا غالب نے لکھا ہے۔ ے

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہمکو اُن سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

چنانچہ یہی حال شیفتہ کے سادہ اشعار خصوصاً بعض مقطعوں کا ہے۔ دیکھ لیجئے۔ ے

اتنی ہی بڑی ہے بیقراری — اب آپ سے اُنس کم کرینگے
مرنے کا مرے نہ ذکر کرنا — قاصد وہ بہت الم کرینگے

چھیڑتے کیوں ہو مجھے جلنے دو وان باتو نکو بس — تم بھلا جاتے رہو گے شیفتہ کی یاد سے
وہ مانع تپش ہے ہمیں شوق اضطراب — بھاتی نہیں ہے شیفتہ ایسی بھی خو مجھے
ہم بوسے دو بہت تجھکو نہ ملینگے شیفتہ — بجز شمیم طرۂ عنبر فشاں نہ ہو
زنجیر آدھی رات کو کھٹکائے اور کون — اے جذب اشتیاق وہ بیباں کسل نہ ہو
ہائے وہ شیفتہ کی بیتابی — تھام لینا وہ تیرے محمل کو!
اس نوبہار حسن کو بدنام مت کرو — تھی شیفتہ کے پہلے سے شورش دماغ میں

آمد آمد میں اسقدر شورش — دیکھئے کیا کریں بہار میں ہم
یاد نے جس کی بھلایا سب کچھ — اُسکی میں یاد بھلاؤں کیونکر

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ | اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

ان سب اشعار میں سادگی مضمون تیر کی سی ہے لیکن بعض الفاظ کی رنگینی اور بعض ترکیبوں کی دلربائی پیروی مومن کا نتیجہ ہے۔

اب ہم آخر میں شیفتہ کے دیوان سے چند منتخب غزلیں نقل کرتے ہیں جن سے ارباب نظر پر روشن ہوجائیگا کہ شیفتہ کی بابت جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بالکل صحیح لکھا گیا ہے۔

غزل

روز غم میں کیا قیامت ہے شب عشرت کی یاد | اشک خوں سے رنگین رنگینیاں صحبت کی یاد
میں ہوں بیکس اور بیکس پر ترحم ہے ضرور | حسن روز افزوں دلا دینا مری حالت کی یاد
طاقت جنبش نہیں، اس حال پر قصد عدم | مر گئے، پہ بھی رہیگی اپنی اس ہمت کی یاد
غالبا ایام حرماں بیخودی میں کٹ گئے | آتی ہے پر آرزو بھولی ہوئی مدت کی یاد
دل لگانے کا ارادہ پھر ہے شاید شیفتہ | ایسی حسرت سے جو ہے گذری ہوئی الفت کی یاد

اپنے جوار میں ہمیں مسکیں بنا دیا | دشمن کو اور دوست نے دشمن بنا دیا
دامن تک اسکے ہاے نہ پہونچا کبھی، وہ آہ | جس ہاتھ نے کہ جیب کو دامن بنا دیا
پروانہ ہے خموش کہ حکم سخن نہیں | بلبل ہے نغمہ گر کہ نوازن بنا دیا
صحرا بنا رہا ہے وہ افسوس شہر کو | صحرا کو جسکے جلوے نے گلشن بنا دیا
اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ | یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

ہند کی وہ زمیں ہے عشرت خیز | کہ نہ زاہد جہاں کریں پرہیز
سخت مشکل ہے ایسی عشرت میں | خطر حشر و بیم رستاخیز
ہے غریبوں کو جرات فرہاد | ہے فقیروں کو عشرت پرویز
عیش نے یاں بٹھا دیا ناقہ | غم نے کی یاں سے رخش کو مہمیز

کوئی یاں غم کو جانتا بھی نہ تھا	بزمِ عشق سو ہے عیش آمیز
بادِ صرصر یہاں نسیمِ چمن	نارِ عنصر سے آتشِ گل تیز

شیفتہ تھام لو عنانِ قلم
یہ زمیں گرچہ ہے سخن انگیز

ان غزلوں میں اور انہیں پر کیا منحصر شیفتہ کے تمام دیوان میں سب سے بڑی خوبی جو انداز دہلی کی جان تھی اور جسکے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کے طرزوں میں امتیاز کیا جاتا تھا۔ یہ ہے کہ انکا مضمون تہذیب کا پہلو لئے ہوئے ہے اور اسکے الفاظ سے متانت اور نفاست ٹپکی پڑتی ہے۔ افسوس کہ سنہ ۱۲۸۶ ہجری میں شیفتہ کا انتقال ہوگیا اور انہیں کے ساتھ اس انداز کا بھی خاتمہ ہوگیا اب اس طرز کو اختیار کرنیوالے تو درکنار اس کے قدردان بھی نہیں ہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ فقط

"حسرت"

طلسم خواب نمبر (۲)

سلسلے کیلئے دیکھو اردوے معلیٰ بابت اگست سنہ ۱۹۰۳ء

ہر جاندار کے واسطے نیند ایک طبعی خاصہ ہے گو اُسکی حالت مقدار متفاوت و مختلف ہو بقول اطبا انسان کے لئے کم سے کم آٹھ گھنٹے سونا ضروری ہے۔ زیادہ جاگنا بجائے خود ایک مرض یا تکلیف ہے۔ اکثر آدمی صرف زیادہ جاگنے ہی سے بیمار ہوجاتے ہیں۔ جسوقت انسان سوتا ہے اُسوقت اُسکے حواس ظاہری مختل یا کند نہیں ہوتے بلکہ سارے دن کے تھکے ماندے چند گھنٹوں کے لئے آرام میں ہوجاتے ہیں۔ حواسوں کے مختل ہونیکی صورت میں نیند بھی اچھی طرح نہیں آتی جب انسان بیمار ہوتا ہے اُسوقت اُسے ایسی میٹھی نیند نہیں آتی جسے ہم طبعی نیند کہہ سکیں۔

بیماریوں اور عارضوں میں نیند کا نہ آنا بھی ایک سخت تکلیف دہ عارضہ ہے۔ بعض دفعات نیند کا آنا ہی ازالۂ علالت کی بین دلیل سمجھا جاتا ہے۔ اور نیند کا نہ آنا موجب تکلیف۔

نیند کی حسب ذیل قسمیں ہیں۔

الف - خواب محض

ب - خواب عمیق

ج - نیم خوابی

د - خواب بیہوشی نما

ہ - خواب عملی

ز - مدہوشی

خواب محض سے وہ خواب مراد ہے جس میں انسان ایک ہلکی نیند میں ہوتا ہے۔ اور خواب عمیق سے وہ خواب جسمیں انسان پر ایک گہری نیند طاری ہوتی ہے۔ اور اسکے حواس ظاہری کے ادراک اور احساس میں ایک خاص غباوت آجاتی ہے۔

خواب محض میں حواس کے اندر چنداں غباوت عائد نہیں ہوتی خواب عمیق میں انسان دنیا و مافیہا سے گویا بالکل الگ ہوجاتا ہے۔ اور معمولی افعال یا حرکات سے اسکا دماغ اثر پذیر نہیں ہوتا۔ اور خلاف اسکے خواب محض میں معمولی حرکات سے ہی آنکھ کھل جاتی ہے۔

نیم خوابی میں اگرچہ انسان سوتا ہے مگر حواس ظاہری میں وہی سرعت اور عمل باقی رہتا ہے جو حالت بیداری میں تھا۔ اس حالت میں انسان کبھی نیند میں ہوتا ہے اور کبھی اردگرد کے واقعات کیفیات یا حرکات بالاجمال اسپر اپنا اثر کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ نیند بھی شامل حال ہوتی ہے اسواسطے اس قسم کی کیفیت بیداری بھی نیند ہی سمجھی جاتی ہے۔

خواب بیہوشی نما وہ خواب ہے جو بوجہ کسی بیماری یا کسی اور حادثے یا کیفیت کے طاری ہوتا ہے۔ اس خواب میں حواس مکدر اور مختل ہوجاتے ہیں چونکہ دماغ ضعیف ہوتا ہے

اسواسطے انسان ایک خواب نما بیہوشی میں پڑا رہتا ہے اس خواب سے انسان راحت اور وہ آسایش حاصل نہیں کرتا جو خوابِ صحت سے متصور ہے۔

خواب عملی وہ خواب ہے جو بذریعۂ مسمریزم یا کسی اور طبی عمل کے عائد کیا جاتا ہے۔

محض بیہوشی۔ بعض اوقات انسان کسی صدمہ یا دوا کے اثر سے بالکل بیہوش ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک گہری نیند میں ہے۔ یہ حالت دراصل نیند نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک عارضہ ہوتا ہے۔ گو دیکھنے والے اُسے نیند ہی سمجھیں مگر درحقیقت وہ ایک حالتِ مدہوشی ہوتی ہے۔

خواہ کسی قسم کی نیند ہو اور خواہ کسی قسم کی بیہوشی اُس میں انسان کی تین حالتیں ہوتی ہیں

(۱) یا تو وہ ایسی نیند میں ہوتا ہے جس میں نہ تو کچھ سنتا ہے اور نہ کچھ دیکھتا ہے۔

(۲) یا کچھ حصہ بالکل غافل سوتا ہے اور کچھ حصے میں خواب کے اندر کچھ دیکھتا اور کچھ تماشا کرتا ہے۔

(۳) یا کل حصہ خواب میں کچھ دیکھتا اور کچھ تماشا کرتا ہے۔

پہلی دو صورتیں عام ہیں اور پچھلی تیسری صورت خاص ہے خواہ کوئی سی صورت ہو یہ ثابت ہے کہ ہر ایک قسم کے خواب میں انسان کچھ نہ کچھ دیکھتا اور سنتا ضرور ہے۔ یہ جدا بات ہے کہ کوئی زیادہ اور کوئی کم۔ جو خواب عملی طور پر عائد کئے جاتے ہیں یا بوجہ خاص صدمات کے طاری ہوتے ہیں یا محض مدہوشی ہوتی ہیں۔ اُن میں انسان کبھی کبھی

لہ ان اقسام خواب کے سوا ایک اور قسم کا خواب بھی ہے جسے بہ اصطلاحِ فقراء صوفیہ مراقبہ یا سمادہی کہتے ہیں اور بہ اصطلاحِ حکما قیاس مفرط تنہائی میں یہ لوگ کسی مقصد پر اسطرح سے خیال یا دھیان کرتے ہیں کہ بالکل اُسی میں غرق اور محو ہو جاتے ہیں اور اُس خاص حالت میں ظاہری محسوسات سے گذر کر باطنی محسوسات پر اس خوبی سے پہنچ جاتے ہیں کہ بہت سے ادق مطالب حل ہو جاتے ہیں۔

مراقبہ۔ قیاسِ مفرط کے قواعد میں تھوڑا سا فرق ہے۔ مراقبے میں کسی نہ کسی مذہبی قانون کی پابندی لازمی ہے اور حکیمانہ طریق میں ایسی پابندی لازمی نہیں۔ لیکن دراصل ایک حکیم بھی گو بظاہر کسی مذہبی قانون کی پابندی نہ کرتا ہو مگر عملاً کسی نہ کسی قاعدے کی پابندی ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ بغیر ایسے قاعدے کی پابندی کے قیاس مفرط میں کامیاب ہونا مشکل ہے

کچھ نہ کچھ خواب کے اندر دیکھتا اور سنتا ہے۔

عملی خواب جب انسان پر طاری کئے جاتے ہیں تو انکے ازالے کے بعد معمول بیان کیا کرتا ہے کہ میں اس عرصے میں ایک ایسی حالت میں رہا ہوں۔ اسی طرح جو لوگ کسی ناگہانی صدمے سے یک لخت بیہوش ہو جاتے ہیں وہ بھی جب ہوش میں آجاتے ہیں تو اکثر کہتے ہیں کہ ہم تو ایک خوشی اور اطمینان سے ایک باغ کی سیر کر رہے تھے۔ اور ہمیں اپنی بیہوشی کا کچھ بھی علم نہیں۔

بعض مریضوں پر جب ڈاکٹری عمل کے لئے بیہوشی طاری کیجاتی ہے تو ڈاکٹری عمل کے بعد یک لخت وہ ایک اجنبی حالت میں اپنے تئیں پاتے ہیں گویا اُنہیں معلوم ہی نہ تھا کہ اُنکے اعضاء پر یہ عمل ہو رہا ہے۔

یہ تمام حالتیں اس امر کا ثبوت یا زندہ نظیریں ہیں کہ خواہ کسی قسم کی نیند ہو اُس میں انسان کے حواس باطنی کسی نہ کسی کام میں مصروف ضرور رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ مانا جائے تو یہ کہا جاویگا کہ جب حواس ظاہری معطل ہو جاتے یا کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں (خواہ بوجہ طبعی نیند کے یا کسی اور وجہ خاص سے) تو پھر وہ کونسی طاقت ہے جو انسان کے اندر کَل کی طرح چل رہی ہے۔

لازمی تو یہ تھا کہ حواس ظاہری کے تعطل یا یکلخت تالم یا تنزل سے ماؤف مُردے کی مانند پڑا رہتا اور سونے کے ساتھ ہی کسی اور عالم کی سیر نکرتا یہ کیا کہ ادھر سوتا ہے اور اُدھر کسی اور شغل میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ تو ضرور کچھ نہ کچھ ہوگی آخر کار یہی کہنا پڑیگا کہ چونکہ انسان کے حواس باطنیہ نیند میں بھی اپنا کام کرتے رہتے ہیں اسواسطے خواب کے اندر بھی انسان بیداری کی طرح مختلف حالتیں اور کیفیں دیکھتا اور سنتا ہے۔

یا یوں کہلو کہ عالم خواب میں بھی عالم بیداری کی طرح انسان کے تصرفات میں کمی نہیں آتی ہے۔ جیسے عالم بیداری میں انسان دونوں قسم کے ظاہری اور باطنی تصرفات رکھتا ہے ایسے ہی عالم خواب میں بھی باطنی تصرفات کی مشق باقی یا زندہ رہتی ہے۔ اس مرحلے پر پہنچکر ہمیں امور ذیل کی تشریح کرنا ضروری اور واجبی ہے۔

الف - خواب کے اندر انسان کے تصرفات کن قوتوں کے ذریعے سے ہوتے ہیں - ؟

ب - کیوں ایسے تصرفات ہوتے ہیں ؟

ج - ایسے تصرفات کی کون کون قسمیں ہیں - یعنی کس کس قبیل سے ہیں ؟

د - ایسے تصرفات پر کوئی حکم لگایا جا سکتا ہے - ؟

ہ - انکی صداقت کہاں تک قابل تشکک اور قابل یقین ہے ؟

انسان کے باطنی حواس حافظہ - متصرفہ - خیال - حس مشترک - واہمہ ہیں - جب انسان سوجاتا ہے تو ان حواس کے تصرف اور تمسک میں ایک قسم کی کمی آجاتی ہے - مگر انکی طبعی حرکت میں فرق نہیں آتا - حافظہ جیسا بیداری میں ہوتا ہے ویسا ہی خواب میں بھی رہتا ہے اسیطرح اور قوتیں بھی عمل کرتی رہتی ہیں - تجربہ ہوچکا ہے کہ تعطل و تکدر حواس کی صورت میں بھی ان اندرونی قوتوں کا عمل اور تصرف جاری رہتا ہے - مریضوں اور پاگلونکا دیوانگی اور شدت علالت کی حالت میں ٹھکانے اور سچے کی باتیں کہنا اور بمصداق "دیوانہ بکار خویش ہشیار" مطلب کی سمجھنا اس امر کی دلیل ہے کہ کسی حالت میں بھی انسان کی باطنی قوتیں کام کرنے سے نہیں رکتی ہیں - جب تکدر و تعطل حواس کی حالت میں، جو واقعی ایک ابتر حالت ہوتی ہے، اور جس سے نیند سو درجے بہتر ہے اور جس میں انسان پوری راحت حاصل کرتا ہے، انسان کی باطنی طاقتیں کام دیے جاتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ سلیم خواب کی صورت میں کیوں وہ کام کرنے سے رہ جائیں - ایک طرف سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ باطنی قوتیں اپنے اپنے تصرفات پر ہر حالت میں غالب رہتی ہیں - جیسے کہ حافظہ ہر حالت میں اپنے محفوظات پر قادر ہے اور واہمہ ہر آن میں وہم پر غالب اور دوسری حالت میں یہ توجیہ کرتے ہیں کہ نیند میں ہوکر ان طاقتونکے تصرفات میں کچھ بھی زور اور اثر نہیں رہتا ہے - اگر واقعی بحالت خواب انکے تصرفات اور محفوظات یا محصولات میں اثر نہیں تو لازم ہے کہ جاگنے پر ان میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے - حالانکہ جب انسان جاگتا ہے تو ساری باتیں اور سارے واقعات یاد آجاتے

ہیں اور اسی طرح یہ کلیں پہ چلنے لگتی ہیں جیسے چند منٹ پیشتر چلتی تہیں کیا آن کی آن میں سب گیا گذرا مصالح موجود ہوگیا - یا پہلے ہی سے موجود تہا - اگر یہ کہا جائے کہ سرمایۂ محصولہ تو اُسی طرح باقی رہتا ہے لیکن بہ عالم خواب اُسکے تصرف میں کمی آجاتی ہے - یہ بہی درست نہیں کیونکہ ان قوتوں کا تصرف بہی تو دو قسموں پر ہے - ظاہری اور باطنی

جسطرح بیداری میں باطنی تصرف لگاتار جاری رہتا ہے اُسی طرح خواب میں بہی رہتا ہے اور اگر حالتِ خواب میں ایسے تصرف کا وجود نہ مانا جائے تو پہر ایک مسئلہ صداقت اور جگ بیتی حالتِ رویا کی تکذیب کن دلائل سے کیجا سکتی ہے - خواب کے اندر دیکہیے تو ہم سب کچہ ہیں اور پہر یہ بہی کہے چلے جاتے ہیں کہ یہ فعل ان قوتوں کا نہیں ہے - اگر یہ کہیں کہ یہ فعل واہمے کا ہے تو وہ بہی تو آخر قوت ہے اور اسکا کیا جواب ہے کہ قوت واہمہ تو خواب میں عمل کرتی رہے اور دوسری قوتیں بالکل عاری ہوجائیں - میں نہیں جانتا اسپر کیا دلائل لائے جا سکتے ہیں -

خواہ عالم بیداری ہو اور خواہ عالم خواب دونوں میں یہ قوتیں عمل کرتی رہتی ہیں کمی بیشی دوسرا مرحلہ ہے - اگر یہ کہا جائے کہ بیداری میں تو انسان کے تعامل سے کچہ نہ کچہ فائدہ بہی ہے - عالم خواب میں کوئی فائدہ متصور نہیں - آجتک ان قوتوں کے ذریعے سے جسقدر سرمایہ حاصل کیا گیا ہے یا قیمتی معلومات جمع کی گئی ہیں - وہ سب عالم بیداری کا سرمایہ ہے - عالم خواب کا فیصدی پانچ بہی نہیں پہر اس سے حاصل -

بحث صرف یہ تہی کہ عالم خواب کے اندر یہ قوتیں کام کرنے سے رہجاتی ہیں - یا برابر کام کرتی ہیں -

دونوں حالتوں بیداری اور خواب میں انکا کام کرنا ثابت ہے - یہ خدشہ کہ کارگذاری خواب کا نتیجہ کیا ہے ایک دوسری بحث ہے - اگر ہم اس نتیجے کو ثابت نہ بہی کرسکیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ -

پہلے یہ قوتیں خواب کے اندر کام نہیں کرتی ہیں -

یا ان کا کوئی نتیجہ نہیں ہوسکتا -

عدمِ علمِ شے، عدمِ وجودِ شے کا مستلزم نہیں۔ پوچھا یہ جاتا ہے کہ رویائے عمل کا نتیجہ یا فائدہ کیا ہے اسکے جواب میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان قوتوں کا لگاتار کام کرنا اور تصرفات یا نتیجۂ تصرفات میں مصروف رہنا محض اس غرض سے نہیں کہ ہمیشہ اُن سے مفید نتائج بھی مرتب ہوا کریں۔ نہیں بلکہ اس غرض سے بھی ہے کہ اُنکی لگاتار حرکت اور مسلسل عمل اُنہیں سُست اور نکمّا نہ ہونے دے۔ اگر عالمِ خواب میں اُنکے تصرفات باقی نہ رہیں تو اس سے اُنکا تعطل لازم آئیگا۔ اور تعطل موجب بطالت قویٰ ہے۔

دوسرے یہ کہ انسان کے قبضے میں یہ قوتیں محض ظاہری تصرفات کے واسطے نہیں دی گئیں۔ بلکہ انکا بہت بڑا منشار ذہنی تصرفات سے متعلق ہی ہے۔ عالمِ خواب کے تصرفات، ذہنی تصرفات کی تکمیل اور تشریح کے واسطے ایک سبق ہیں اور اُن سے انسان پر وہ راہیں کُھلی ہیں جنکا انکشاف ذہنی اور روحانی اغراض کے لئے لابدی ہے۔

تیسرے یہ کہ اِن قوتوں کا خواب کے اندر بھی عالمِ بیداری کی طرح یا اُسکی برابر کام کئے جانا اور بند نہونا اس امر کی بھی دلیل اور اشارہ ہے کہ یہ قوتیں ہر حالت میں کام دیسکتی ہیں اور انکی رسائی کہانتک ہے۔

چوتھے یہ کہ اس رویائے عمل سے اسکا ثبوت ملتا ہے کہ عالمِ بیداری میں قیاس

ــــــــــــــــــــ

لہ موت کا مسئلہ بھی ایک قابل بحث مسئلہ ہے۔ جہاں موت کی تشریح اور توضیح میں اور دلائل لائے جاتے ہیں وہاں عالمِ خواب بھی ایک عملی یا زندہ دلیل ہے۔ صوفیائے کرام اور حکمائے نامدار نے موت کا نام نوم اکبر اور خنید کا نام نوم اصغر رکھا ہے جو لوگ علوم الٰہی کے قائل اور مبصر ہیں اُنکے مسلمات کے اعتبار سے نوم اصغر کی کیفیت نوم اکبر یعنی موت کی کیفیتوں کے انشراح اور انکشاف کے لئے ایک اچھی نظیر ہیں۔ اگر ایک انسان خواب میں خواب کے اندر کسی حالت میں ہو تو وہ باوجود زندہ ہونیکے دنیا کے حالات اور واردات سے بالکل بے خبر ہوتا ہے اور باوجود اسکے خواب کے اندر اُسپر کچھ بار یا کچھ رنج بے تعلق دنیا کا نہیں ہوتا۔ اور گر وہ اس حالت میں رہے اور اُس کی غیر حاضری میں تمام دنیا دگرگوں ہو جائے تو اُسپر کوئی صدمہ بھی نہیں ہوگا وہ اپنے تئیں اُسیطرح پاویگا گویا ایک اور دنیا میں انہیں تصرفات کے ساتھ موجود ہے یہ کیفیت کیفیتِ موت کے لئے ایک نظیر ہے اور اس سے اُس پرانے قول کی تشریح ہوتی ہے "الموت انتقال من الدار الی دار الاخریٰ" اور انسان اپنے اطمینان کیلئے یہ کیفیت مشاہدہ کرسکتا ہے کہ دراصل موت گویا کوئی بے نتیجہ عمل نہیں ہے۔ ۱۲

اور فکر کے ذریعے سے انسان کن کن مدارج اور منازل کی سیر کر سکتا ہے۔

پانچویں یہ کہ جب انسان کی قوتیں عالمِ خواب میں اسقدر کام کر سکتی ہیں تو اگر اُن سے کسی قاعدے یا عمل کے ذریعے سے کام لیا جاوے تو کہانتک کامیابی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اسی شہادت سے مقناطیسی عالموں نے علمِ مقناطیس نکالا اور اسی سے صوفیائے کرام اور حکماے عالی مقام نے مراقبہ یا سمادہی اور قیاسِ مفرط یا فراستِ تام کی بنیاد رکھی اور اُن عجائبات کا مشاہدہ کیا جو ظاہری حواس سے کوسوں دور تھے۔

مرزا سلطان احمد

ہاتھی دانت

۱۔ ہاتی دانت کیا ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ ہاتی دانت صرف ہاتی کا دانت ہے جسکو کام میں لاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے مگر غلطی یہ ہے کہ اسکا ماخذ صرف ہاتی کا دانت سمجھا جاتا ہے حالانکہ چند اور جانور بہی ہیں جنکے دانتوں سے ہاتی دانت نکلتا ہے۔ پس یہ دیکھنا بہت آسان ہے کہ یہ نام غلط ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ پہلے لوگونکو اُن جانورونکا علم نہ تہا جنکے دانتوں سے ہاتی دانت نکلتا ہے۔

جیسے ہڈی میں دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک اوپر کا سخت خول اور دوسرا اندر کا نرم مغز۔ ویسے ہی دانت میں بہی دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک تو سفید۔ چکنا۔ نہایت سخت خول ہوتا ہے اور دوسرا خول سے زیادہ چکنا مگر اُس سے کسیقدر نرم اندرونی حصہ ہوتا ہے باہری حصے کو خولِ دنداں اور اندرونی حصے کو مغزِ دنداں کہتے ہیں۔ جس چیز کا نام ہاتی دانت ہے وہ چند دانتونکا مغز ہے۔ ہم آگے چلکر اُن جانورونکا مختصر تذکرہ لکہینگے جنکے دانتوں سے ہاتی دانت ملتا ہے۔

اگر ہم اپنے دانتوں کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بناوٹ کے لحاظ سے تین قسم کے ہیں۔ پہلے تو سامنے والے قینچی نما دانت ہیں جن سے ہم ماکولات کو کاٹتے ہیں۔ ان دانتوں کے بغل میں دائیں بائیں دو دو نکیلے۔ تیز دانت ہیں جو گوشت کی سی چمڑی چیزوں کو چیرنے پھاڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اور ان نکیلے دانتوں کے بغل میں دونوں طرف چند چپٹے۔ چوڑے۔ مضبوط دانت ہیں جن سے ہم نگلنے کے پہلے کھانے کو چباتے ہیں۔ قسم اول کے دانتوں کو انسی زرس یعنی (قینچی نما) قسم دویم کو کینائن یعنی (سگ صفت یا کتوں کے سے دانت) اور قسم سویم کو مولر۔ یعنی آسیا صفت یعنی چکی کے سے دانت) کہتے ہیں۔

فطرت نے کوئی شے بلا مصلحت نہیں بنائی۔ ہر شے سے ایک نہ ایک فائدہ۔ کوئی نہ کوئی غرض مد نظر ہے۔

اونٹ کے چوڑے۔ گدی دار۔ چپٹے سم اسلئے بنائے کہ وہ ریگستانوں میں آسانی سے چل سکے۔ اُسکی گردن لمبی اسلئے بنائی کہ اپنا سر زمین تک جھکا سکے۔ برفستانی خطوں کے جانوروں کے جسم پر گھنے اور لمبے بال رکھے تاکہ سردی کی اذیت سے ہلاک نہ ہوجائیں۔ برعکس اسکے گرم ملک کے جانوروں کی کھال پر بہت چھدرے اور چھوٹے چھوٹے روئیں ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف جانوروں کے دانتوں کی بناوٹ بھی اُنکی ضروریات کے مطابق ہے۔ گوشتخوار جانوروں کے دانت لمبے۔ نکیلے اور ذرا خمدار ہوتے ہیں تاکہ وہ کچے گوشت کو آسانی سے چیر پھاڑ سکیں۔ گھاس کھانیوالے جانوروں کے سامنے کے دانت۔ سیدھے چاقو کی پھل کی طرح تیز ہوتے ہیں تاکہ وہ گھاس کو آسانی سے کاٹ سکیں۔ اُنکے چبانیوالے دانت بھی چپٹے اور مضبوط ہوتے ہیں۔

فطرت کا یہ ایک مسئلہ ہے کہ استعمال سے اعضائے جسم کے نشو و نما میں ترقی ہوتی ہے۔ بڑھئی کی کلائی کے رگ اور پٹھے شب و روز کے استعمال سے نہایت مضبوط ہوجاتے ہیں۔ علی ہذا القیاس جسم کے ہر ایک عضو کو جداگانہ طاقت پہونچانے کے لئے خاص خاص کھیل اور کسرتیں مقرر ہیں۔ برعکس اسکے اگر کسی عضو کو بیکار چھوڑ دو تو

رفتہ رفتہ اسکی طاقت زائل ہوجاتی ہے۔ رگیں سست ہوجاتی ہیں اور وہ عضو اپنا فرض منصبی انجام نہیں دیسکتا۔ ایسی مثالیں بسا اوقات سادہوون میں ملتی ہیں جو نفس شکنی کے عوض اعضا شکنی کر بیٹھتے ہیں۔ کوئی منہ سادہ لیتا ہے۔ اشاروں کنایوں سے اپنے خیالات کا ناکافی طور پر اظہار کرتا ہے۔ آخر چند برسوں میں زبان بیکار پڑے رہنے سے قوت گویائی سے محروم ہوجاتی ہے۔ کوئی یہ خیال کرکے کہ نفسانی حرکات ہاتھوں ہی سے سرزد ہوتے ہیں ہاتھوں کے استعمال سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ اسکا نتیجہ بھی معلوم ہے۔ فطرت کا یہ مسلمہ مسئلہ اور اعضا کی طرح دانتوں پر بھی راست آتا ہے۔ گوشتخوار جانوروں کے ([illegible]) اور گھاس کھانیوالوں کے ([illegible]) ور دانتوں سے زیادہ بڑہتے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ حتے کہ بسا اوقات قسم اول کے جانوروں کے انسی زارس اور قسم دوئم کے جانوروں کے کنیائن ہوتے ہی نہیں۔ یا تو فطرت نے انکو یہ دانت عطا ہی نہیں کئے یا پشتہا پشت کے بیکار پڑے رہنے سے انکا وجود ہی جاتا رہا۔

ہاتی دانت کہاں سے آتا ہے۔ یہاں ہم اُن جانوروں کا مختصر حال لکھتے ہیں جنکے دانتوں سے ہاتی دانت نکلتا ہے۔

ا۔ ہاتی جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے گھاس کھانیوالے جانوروں میں ہے۔ پس اسکے انسی زارس دوسرے دانتوں سے زیادہ بڑہتے ہیں۔ ان دانتوں کی حیرت انگیز بالیدگی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دانتوں کے نیچے والی قطار میں اس قسم کا کوئی دانت نہیں ہوتا کہ ان کی بالیدگی میں مخل ہوسکے ہاتی دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک افریقہ کا ہاتی۔ دوسرا ایشیا کا ہاتی۔ افریقہ کا ہاتی قریب قریب تمام افریقہ میں پایا جاتا ہے اور ایشیائی ہاتی سے قد و قامت میں کچھ نکلتا ہوتا ہے۔ چنانچہ اسکے دانت بھی ایشیائی ہاتی سے بڑے ہوتے ہیں۔ افریقی ہاتی بالعموم دنتار ہوتے ہیں۔ حتے کہ ہتنیوں میں بھی شاذ ایسی ہوتی ہیں جسکے دانت نہیں ہوتے۔ افریقہ کے وحشیوں نے اس جانور کا شکار کرنے کے کئی مختلف طریقے نکالے ہیں۔

ہاتی عموماً غول باندھکر چرنے کے لئے نکلا کرتے ہیں۔ پس جب وہ ایسے مرغزار وں

میں جل نکلتے ہیں جہاں گھاس سوکھی اور لمبی ہوتی ہے تو شکاری ان مرغزاروں میں آگ لگا دیتے ہیں۔ جب چوطرفہ شعلے ہی شعلے نظر آنے لگتا ہے تو ہاتھیوں کا غول کہیں نکل جا نہیں سکتا اور دم گھٹ جانے سے نیز جلجانے سے وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ گو اس طرح شکار کرنے سے سیکڑوں کا وارا نیارا دم کے دم میں ہو جاتا ہے مگر اس میں علاوہ اسکے کہ وحشیانہ پن اور قساوت قلبی کا اظہار ہوتا ہے ایک نقص یہ بھی ہے کہ آگ کی آنچ لگ جانے سے دانت سیاہ ہو جاتے ہیں اور اکثر جلکر چونے کی طرح بھربھرے ہو جاتے ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھیوں کی چراگاہوں میں بڑے بڑے گڑھے کھود دیتے ہیں اور ان پر پتلی پتلی لکڑیاں بچھا کر گھاس پھوس پتے وغیرہ سے ڈھک دیتے ہیں۔ جب ہاتھیوں کا غول خطرے سے بیخبر چرتا ہوا آنکلتا ہے تو ان گڑھوں میں گر پڑتا ہے اور کسی طرح نہیں نکل سکتا شکاری انکو ہفتوں تک بھوکا پڑا رہنے دیتے ہیں۔ آخر جب وہ غذا کے نہ ملنے سے نحیف و بیدم ہو جاتے ہیں تو انکو ایک ایک کرکے نکال لیتے ہیں۔ زندہ نکالنا اسی صورت میں ہوتا ہے جبکہ شکاریوں کو گوشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر صرف دانت لینا چاہتے ہیں تو بیچارے ہاتھیوں کو گڑھے میں بھوکوں مار ڈالتے ہیں۔

افریقی ہاتھی کا ہاتھی دانت نہایت قیمتی ہوتا ہے۔ اسکا وزن عموماً ۸۰ پونڈ سے ۱۰۰ پونڈ تک ہوتا ہے مگر بعض اوقات ایسے دانت بھی پائے جاتے ہیں جنکا وزن ۴۰۰ پونڈ ہوتا ہے اور لمبائی ۱۰ فٹ۔ اس قسم کے ایک جوڑی دانت کی قیمت ایک حبشی کو پانچ ہزار پونڈ ملے تھے۔

ایشیائی ہاتھی جیسا ہم پہلے کہہ چکے ہیں افریقی ہاتھی سے ڈیل ڈول میں کچھ دبتا ہوتا ہے اور برہما۔ سیام۔ لنکا۔ گجرات و چند دیگر جنگلی مقاموں میں پایا جاتا ہے۔ اس قسم میں صرف ہاتھیوں کے دانت ہوتے ہیں ہتھنیاں عموماً بلا دانت کے ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسرا جانور جسکے دانت سے ہاتھی دانت نکلتا ہے دریائی گھوڑا ([illegible]) ہے یہ جانور سؤر کی قسم سے ہے مگر ہندوستانی سؤروں سے کہیں جسیم ہوتا ہے۔ اونچا تو بھینس سے زیادہ نہیں ہوتا مگر لمبان میں بھینس کا ڈیوڑھا ہوتا ہے۔ اسکا وطن افریقہ ہے۔

چونکہ وہاں کی آب وہوا نہایت گرم ہوتی ہے اور یہ جانور گرمی کو برداشت نہیں کرسکتا عموماً دریا کے کنارے سایہ دار مقاموں میں رہتا ہے اور سارے دن پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ گو اس کی خوراک گھاس ونباتات ہے اور قاعدے کے مطابق اُسکے انسی زرس کو بڑہنا چاہیئے مگر چونکہ اُسے محافظت کے لیئے دوسرے جانوروں سے لڑنا اور اُنکو زخمی کرنا پڑتا ہے۔ اس کام کے لیئے کیناین زیادہ موزوں ہوتے ہیں اور یہی دانت دوسرے دانتوں سے زیادہ بڑہتے اور ہاتھی دانت کے کام میں آتے ہیں۔ یہ ہاتھی دانت نہایت سخت۔ سفید ہوتا ہے اور جلد خراب نہیں ہوتا۔ مگر اتنا بڑا نہیں ہوتا کہ اُس سے چا۔ پائی کے پائے یا شمعدان یا اسی قسم کی آرایش کی کوئی دوسری چیز بن سکے۔ اُس سے صرف شطرنج کے مہرے۔ چوپڑ کے پانسے۔ بیرڈ کھیلنے کی گیند اور نقلی دانت بناتے ہیں۔ اس جانور کو شکار کرنے کا وحشیوں نے یہ طریقہ نکالا ہے کہ لوہے کے لمبے لمبے نوکدار بھالے بنواتے ہیں اور کشتیوں میں بیٹھکر شکار کو نکلتے ہیں کیونکہ دریائی گھوڑا زیادہ تر پانی ہی میں رہتا ہے۔ مگر چونکہ وہ طبعاً خشکی کا جانور ہے پانی میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں ٹہیر سکتا پس جوں ہی وہ سانس لینے کے لیئے سر کو باہر نکالتا ہے ووں ہی شکاری جو تاک میں لگے ہوتے ہیں اپنے اپنے بھالے اُسپر سر کرتے ہیں۔ آخر متواتر واروں سے گھبرا کر وہ پانی میں ڈوب جاتا ہے مگر تنفس کی ضرورت چند منٹوں میں پہر سر کو باہر نکالنے پر مجبور کرتی ہے اور پہر پہلے کی طرح بھالونکی بوچھار پڑنے لگتی ہے یہانتک کہ یہ جانور خون کے ضائع ہوجانے یا کاری زخمونکے لگنے سے مرجاتا ہے اور کئی گھنٹونکے بعد اُسکی لاش پانی کے اوپر تیرتی دکھائی دیتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ اتنا برہم ہوجاتا ہے کہ اپنے حملہ کرنیوالونکی کشتیونکو الٹ دیتا ہے اور شکاریونکا شکار کرڈالتا ہے مگر خلقتاً کسیقدر ڈرپوک ہوتا ہے اور جوں ہی شکاریونکی بو اُسکی ناک میں پہونچتی ہے وہ بھاگ جانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہانتک کہ بعضے بعضے ایک رات میں سیکڑوں میل طے کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔

آج سے چالیس پچاس برس پہلے اس جانور کا وجود یوروپی دنیا میں مطلق نہ معلوم تھا۔ مگر اب تو وہ یورپ کے عجائب خانوں میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اُس کی کہال ایک انچہ

سے زیادہ موٹی ہوتی ہے۔ بندوق کی ایک گولی اگر سر میں نہ لگے تو اُسے مار نہیں سکتی۔ افریقہ کے وحشی اُسکا گوشت بڑے چاؤ سے کھاتے ہیں اور ایک انگریزی سیاح کا قول ہے کہ اُسکا گوشت دُبلے ہرن کے گوشت سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرا جانور جسکے دانت سے ہاتی دانت نکلتا ہے والرس (Walrus) یا دریائی شیر ہے۔ یہ جانور یورپ کے شمال کے سمندر میں پایا جاتا ہے۔ یہ خطے سال کے بڑے حصے میں برف سے ڈھکے ہوتے ہیں۔ والرس گوشتخوار جانوروں کی قسم سے ہے پس اسکے دو کیسنائن بہت زیادہ بڑھتے ہیں۔ مگر یہ ہاتی دانت بہت قیمتی نہیں ہوتا کیونکہ اس کی رنگت زردی مائل ہوتی ہے اور بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ اس جانور میں عقل انسانی کا جتنا حصہ ہے اتنا شاذ کسی دوسرے جانور میں ہوگا۔ چشم دید روایت ہے کہ ایک بار کسی شکاری نے ایک والرس پر بندوق چلائی۔ وہ اس گولی سے ہلاک ہوا اور فوراً پانی میں ڈوب گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد بہت سے دریائی شیر کشتی کے آس پاس تیرتے دکھائی دیئے اور کشتی کو اپنی پشت سے الٹ دینے کی کوشش شروع کی۔ پہلے تو شکاری بہت خائف ہوئے مگر کوئی چارہ نہ دیکھکر بندوقوں کی متواتر باڑھیں سر کرنی شروع کیں۔ تب کہیں جاکے یہ بلا سر سے ٹلی۔

۴۔ آج سے کئی ہزار برس پہلے سیبریا میں ایک خاص قسم کا ہاتی پایا جاتا تھا جو موجودہ ہاتھیوں سے قد و قامت میں کہیں بڑا ہوتا تھا اور جسکے جسم پر بڑے بڑے روئیں ہوا کرتے تھے اب یہ جانور صفحۂ زمین پر کہیں نہیں رہا۔ اسکو علماء علم حیوانات نے (Mammoth) میمتھ کہا ہے۔ سیبریا دنیا کے نہایت سرد حصوں میں ہے اور وہاں برف باری کی یہ حالت ہے کہ ایک ایک رات میں زمین پر کئی کئی فٹ برف جم جاتی ہے۔ اگر کوئی ذیروح قسمت کا مارا ان برف کے تودوں کے تلے دب گیا تو پھر اُسکو اُٹھنا نصیب نہیں ہوتا۔ غالباً ان ہاتیوں کا بھی یہی حال ہوا کیونکہ آجکل جب برف معمول سے زیادہ پگھلجاتی ہے تو کبھی کبھی ہڈی اور دانت کے ڈھیر کے ڈھیر ملتے ہیں۔ واضح رہے کہ برفستانی مقاموں میں سردی کے باعث چیزیں نہیں سڑتیں۔ اور یہ دانت باوجود ہزارہا برس سے پڑے رہنے کے ابی تک صحیح و سالم

پائے جاتے ہیں۔ ہاں بعض بعض حالتوں میں وہ چونے کی طرح بُر بُرے ہوجاتے ہیں
ان دانتوں اور ہڈیوں کے انبار کا ملنا یہ ثابت کرتا ہے کہ میتھ غول باندھکر رہا کرتا تھا
اور وقتاً فوقتاً غول کا غول انہیں برفباریوں کا شکار ہوا کرتا تھا۔ ان دانتوں سے نکلا ہوا ہاتی
اونیٰ درجے کا ہوتا ہے کیونکہ مدت تک پڑے رہنے سے اُس کی خوبی میں کچھ نہ کچھ فرق آجاتا
ہے۔ علاوہ اسکے جوں ہی وہ برف سے باہر نکلتا ہے اُس میں زمانے کا اثر ہونے لگتا ہے

ہاتی دانت کی خاصیتیں۔ ہاتی دانت ہڈی سے بہت مشابہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ دونوں میں تمیز کرنا
آسان کام نہیں۔ ہڈی بھی سخت وسفید ہوتی ہے اور ہاتی دانت بھی۔ مگر یہ اُس سے زیادہ
وزنی۔ زیادہ چکنا ہوتا ہے اور اُسکے اجزا آپس میں خوب گھتے ہوتے ہیں۔ سب سے نمایاں
اور بین فرق یہ ہے کہ ہاتی دانت میں پتلی پتلی سیاہی مائل دھاریاں ہوتی ہیں جیسی سنگمرمر
میں اور اکثر لکڑیوں میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسی دھاریاں ہڈیوں میں مطلق نہیں ہوتیں۔ جب بازار
میں ہاتی دانت کی کوئی چیز خریدنے جاؤ تو پہلے اُسے خوب غور سے دیکھو۔ اگر اُس میں دھاریاں
نظر آئیں تو اُسکے ہاتی دانت ہونے میں کوئی کلام نہیں ورنہ سمجھ لو کہ ہڈی ہے۔

ہاتی دانت کا استعمال ہاتی دانت ایسی خوبصورت۔ مضبوط۔ دیرپا شے ہے کہ اس سے
روزانہ ضروریات و تکلفات کی ہزاروں ہی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ چاقو کے دستے۔ چھاتے اور
چھڑیوں کی مٹھیاں۔ بٹن۔ سلمچی پیالے۔ انگریزی قلم کے ہولڈر۔ عطردان وغیرہ وغیرہ نہایت
عام چیزیں ہیں۔ اسکے نقلی دانت بھی بنتے ہیں جو بڑے دامول فروخت ہوتے ہیں۔
جاپان اور چین میں ہاتی دانت پر اس خوبی وصفائی سے نقشکاری کرتے ہیں کہ یہ دونوں
ملک اس صنعت کے لئے مشہور ہیں۔ یونان کی پُرانی خانقاہوں میں ہاتی دانت کی تراشی
ہوئی مورتیں پائی جاتی ہیں جو باوجود مرور ایام کے ابھی تک زمانے کے ہاتھوں سے بچی ہوئی
ہیں۔ مارواڑ میں اسکی چوڑیاں عام طور پر استعمال کیجاتی ہیں۔ امرتسر میں اسکے ریشے نما تار
تراش کر خوبصورت مورچھل بنا لیتے ہیں جو بالکل بال کے معلوم ہوتے ہیں۔ آبنوس
کی لکڑی چونکہ بہت سیاہ ہوتی ہے اسپر ہاتی دانت کی کیلیں۔ خوبصورت پھول وغیرہ
نہایت زیب دیتے ہیں۔ میسور میں ہاتی دانت کا کام ابھی تک بہت اچھا بنتا ہے۔

ابھی حال میں مہاراجہ صاحب بہادر بنارس کے پاس ہاتی دانت کی چند آرایشی چیزیں تھیں جو اُنہوں نے لارڈ کرزن کے نذر کردیں۔ ہندوستان میں مشکل سے کوئی پُرانا قدیم گھرانا ہوگا جہاں ہاتی دانت کی دو ایک نادر اشیاء نہ پائی جائیں۔ ایسی نایاب چیزیں گو اب تقریباً معدوم ہیں اور نہ اُنکا کوئی پرساں حال ہے مگر قدیم صنعتوں کو دیکھکر ہم کہسکتے ہیں کہ ہندوستان میں ہاتی دانت کی نقش کاری اعلیٰ درجے پر پہونچی ہوئی تھی۔ احمد آباد اور مدراس کی نمایشگاہوں میں جو نیشنل کانگرس کے ضمن میں منعقد ہوئی تھیں ہاتی کی عجیب وغریب چیزیں پیش کی گئی تھیں۔ اُنکو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ہندوستان اہل فن صنّاعوں سے خالی نہیں ہے مگر زمانے کی ناقدری نے اُنکو دل شکستہ بنا دیا ہے۔

ہاتی دانت کی تجارت فی زمانہ یورپ تمام زمانے کی تجارت کا مرکز ہو رہا ہے۔ چنانچہ ہاتی دانت کے خرید وفروخت کی بازار بھی وہیں لگتی ہے۔ کل یورپ میں تین شہر بالخصوص اس تجارت کے لئے مشہور ہیں۔ لندن اور لورپول انگلستان میں۔ اور انٹورپ ڈنمارک میں۔ انگریزی مقبوضات میں جہاں کہیں ہاتی دانت پایا جاتا ہے (مثلاً ہندوستان۔ برہما۔ لنکا۔ مشرقی افریقہ۔ جنوبی افریقہ) وہاں سے لندن یا لورپول کو بھیجا جاتا ہے کیونکہ ملکی تعلقات سے تجارتی تعلقات بڑہتے ہیں۔ کانگو کی خود مختار سلطنت جو وسطی افریقہ میں ہے ہاتی دانت کا سب سے زرخیز انبار خانہ ہے کیونکہ وہاں ہاتی اور دریائی گھوڑا دونوں بکثرت پائے جاتے ہیں اور چونکہ ہاتی دانت وہاں تجارت کی قیمتی جنس سمجھا جاتا ہے، ان جانوروں کی قانوناً محافظت کیجاتی ہے۔ اس سلطنت کا ملکی تعلق ڈنمارک سے ہے۔ (کیونکہ پہلے پہل ڈچ کسانوں نے اس خطے کو نوآباد کیا تھا) پس یہاں کا ہاتی دانت انٹورپ کو جاتا ہے جو ڈنمارک کا تجارتی مقام ہے۔ ہندوستان میں اسکو خاص تجارتی جنس نہیں سمجھتے پس تاجروں کا خیال بھی اسکی جانب کم راغب ہے۔

ہاتی دانت کے متعلق چند متفرق معلومات۔ لکڑی کی طرح ہاتی دانت میں بھی بعض اوقات بدنما دہبے اور داغ پڑجایا کرتے ہیں جس سے اُس کی وقعت میں فرق آجاتا ہے۔ بعض اوقات

دانت بجائے سیدھے بڑھنے کے نصف دائرہ نما شکل میں بڑھتے ہیں جس سے اُنکا ہاتھی دانت بھی ٹیڑھا ہوجاتا ہے۔ جیسے گیلی لکڑی کی بنی ہوئی چیزوں میں سوکھنے پر کسیقدر خم آجاتا ہے اُسی طرح تازہ ہاتھی دانت کی چیزوں میں بھی۔ پس قبل اسکے کہ اس سے چیزیں بنائی جائیں اسکو دھوپ میں اچھی طرح خشک کرلیتے ہیں۔ کم عمر ہاتھی کا ہاتھی دانت ایسا ٹھوس نہیں آتا جیسا پڑاسنے ہاتھی کا۔ عموماً مغز وندان دانتونکے سرے کی طرف ہوتا ہے۔ جڑ کھوکھلی ہوا کرتی ہے۔ ہاتھی دانت کو بعض اوقات تراش کرکے کتابونکے سے پتلے پتلے اوراق بناتے ہیں اور کیمسٹری ہمکو ان مرکبات کا پتہ بھی بتلاتی ہے جنسے ہم ان اوراق پر حروف کندہ کرسکتے ہیں۔ فقط

نواب راسے۔ از پرتابگڈھ

حضرت مولانا شاہ محمد حسین الٰہ آبادی قدس اللہ سرہٗ

معمولات حضرات صوفیہ میں مسئلہ سماع سے زیادہ مختلف فیہ ہے۔ بعض لوگ سماع کو قطعاً حرام بتاتے ہیں، بعض اسے بجملہ عبادات تصور کرتے ہیں اور بعض اسے جائز سمجھتے ہیں لیکن بلا مزامیر۔ راقم کے نزدیک سماع ہر صورت جائز ہے بلکہ صوفی کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ منقولی دلائل سے قطع نظر کرکے بھی دیکھئے تو جس شغل سے روح میں جوش اور دل میں ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے ناجائز قرار دینا کسی طرح قرین انصاف نہیں ہے۔ حال میں بزمانہ عرس حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، جو واقعہ حضرت خواجہ بہشت
۱۳۲۲ھ
مولانا شاہ محمد حسین قدس اللہ سرہ کے وصال کا گذرا وہ قابل غور ہے۔ ۲ رجب کو بہ تقریب عرس نواب سرور جنگ کے ہاں جلسۂ سماع میں اجمیر شریف کے قوال حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی غزل (آتش برو کشیدی ہمچو مکار آمدی) گارہے تھے محفل پر ایک خاص حالت طاری تھی۔ آپ ہر مصرعہ کی شرح فرماتے جاتے تھے۔ جب قوال تقطیع پر پہونچے (گفت قدوسی فقیرے در فنا و در بقا۔ خود بخود آزاد بودی خود گرفتار آمدی) تو آپنے "خود بخود آزاد" کی تکرار فرمائی اور نفسِ نفیس کی طرف اشارہ کیا۔ تیسری مرتبہ ادا کرنا چاہتے تھے کہ سربسجدہ ہوگئے اور آناً فاناً منزل مقصود پر پہونچے۔ اور تقرب باطنی کے علاوہ تقرب ظاہری بھی یہ حاصل کیا کہ مزار مبارک حضرت خواجہ غریب نواز کے زیر سایہ جگہ پائی۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت شاہ صوفی جان مدظلہ نے جو آپکے قریب ہی بیٹھے تھے سب سے پہلے فرمایا کہ آپ نے وصال فرمایا۔ پھر بھی لوگونکو شبہ رہا اور ڈاکٹر نے فصد لی لیکن کچھ نہوا۔

آپکے وصال کی خبر جب علیگڈھ پہونچی تو خان بہادر مولوی زین العابدین صاحب نے دیوان حافظ کے ذریعے سے لسان الغیب حضرت خواجہ شیراز سے سوال کیا کہ آپ مولانا کی گذشتہ اور موجودہ حالت سے آگاہ کیجئے۔ اسکے جواب میں حضرت حافظ کی یہ مشہور غزل نکلی

زاہد خلوت نشیں دوش بہ میخانہ شد
از سر پیماں گذشت بر سر پیمانہ شد

صوفی مجلس کہ دی جام و قدح میشکست
دوش بہ یکجرعۂ عاقل و فرزانہ شد

منزل حافظ کنوں بارگہ کبریاست
دل بر دلدار رفت جاں بر جانانہ شد

یہ پوری غزل گویا حضرت کی مکمل سوانح عمری ہے۔ کیونکہ آپ مولانا عبد الحی مرحوم فرنگی محلی کے شاگرد تھے اور پہلے سماع وغیرہ کو جائز نہ سمجھتے تھے مگر کچھ دنوں کے بعد جب حضرت مولانا شاہ امداد اللہ قدس سرہٗ مہاجر کے مرید ہوئے اور سماع سے ذوق پیدا ہوا تو ابتدا میں چھپ چھپ کر دروازہ بند کر کے سنتے تھے جسکا اشارہ مطلع میں ہے۔ جس مجلس میں آپکا وصال ہوا اسمیں قوالوں سے نغمہ کی فرمایش کی اور حضرت شاہ صوفی جان قبلہ کیطرف اشارہ کر کے فرمایا کہ صوفی کے مارڈالنے کے لئے یہی کافی ہے۔ خان بہادر موصوف نے مقطع کے دوسرے مصرعے سے جو حضرت کے قرب حق کی خبر دیتا ہے بہ تعمیہ الفاظ "باب لم" یہ تاریخ نکالی ہے۔

صوفیٔ صافی نہاد شاہ محمد حسین
فانی فی اللہ گشت از ہمہ بیگانہ شد

حافظ خوشخواں مذاکرہ "باب دلم"
دل بر دلدار رفت جاں بر جانانہ شد"
۱۹ ۱۳

منجملہ دیگر صفات ظاہری و باطنی، مولانا مثل بعض اولیائے متقدمین شاعری کا بھی بہت اچھا مذاق رکھتے تھے چنانچہ آپکی ایک غزل درج کیجاتی ہے۔

مہ گردوں ندارد تاب حسن بیحجاب امشب
کہ باشد گرمیٔ نظارہ برق اضطراب امشب

سمند ناز را نازم کہ با ایں گرم جولانی
عناں گیر تحمل گشت با گرد رکاب امشب

شہ بیناش پروائے نہ با صہبا سر و کارے
کہ مست از جلوۂ خویش ہست چشم نیمخواب امشب

خدارا یکنفس با خوش نگاہاں گرم الفت شو
بنائے زہد را ہیشو و کمیر خراب امشب

تپیدن آرزو دارد خدارا رخصت آہے
دل شوریدہ تنگ آمد ز ضبط اضطراب امشب

شب تارم بہ ہجر اتش نباشد قابل نورے
زبار یاس دارد شعلۂ شمع اضطراب امشب

مکیدم لعل ساقی را واز ہوش و خرد رفتم
دوبالا نشہ دارد بر لبم صہبائے ناب امشب

ز سیل گریہ طرح تر دامنی ریخت در عالم
کہ دامن تر تواں فرمود از موج شراب امشب

ز خجلت آب شد اما ندارد جز نگوں بختی
عجب دارم من از بیداریٔ چشم حباب امشب

سنا ہے کہ آخری حج میں آپنے مدینہ منورہ میں دعا کی تھی کہ یا میں مدینہ میں رہوں یا پھر اجمیر میں۔ سو وہ آرزو پوری ہوئی۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد بحالت وجد اس قیاس کیا گیا تھا شاید ہی کسیکا انتقال ہوا ہو۔ اللہ اللہ خدا کے محبوب بندے اسطرح شہید شوق ہوتے ہیں۔ فقط

انتخاب بیاض جناب حکیم مرزا جمشید علیخانصاحب راسخ دہلوی

محمد حنیف خاں متخلص بہ یار

لالہ در خاکش شگفتہ ست ہنوز — خونِ فرہاد نخفتہ ست ہنوز

ولہ

غمہاے دل ز سینہ گگفتن نمی رود — این گرد خانہ خیز برفتن نمی رود

سراج الدین علیخاں آرزو

دل بطاقِ ابروِ اوے پرستی میکند — چون کبوتر در میانِ کعبہ مستی میکند

ولہ

گر بروے تو زلیخا مژہ وا میکرد — انچہ در خواب ندیدہ است تماشا میکرد

میر شرف الدین علی پیام

یک گرد باد قیس ز ویرانۂ من است — از خاک برگرفتۂ دیوانۂ من است
روشندلی عزیز جہانم نمودہ است — چون شمع ہر کجا کہ روم خانۂ من است

محمد خاں دیوانہ

بہار آمد صبا گلدستہ اسے تازہ می بندد | پریشاں نسخہ گل را دگر شیرازہ می بندد
بگلشن بود بر شاخ گلے وی آشیانِ من | چہ ۱۱ امروز بر من باغباں دروازہ می بندد

میر محمد افضل ثابت

اینقدر ہا از دلِ صد لخت با غافل مباش | پارہ چوں لالہ خوں شد پارہ را بوختیم

میرزا رضی دانش

سوختیم و سوزشِ ما بر کسے ظاہر نشد | چوں چراغانِ شبِ مہتاب بیجا سوختیم

راجہ انند رام مخلص

زرخسارِ درخشانِ تو چوں یکسو نقاب افتد | چو قندیل طلا آتش بجانِ آفتاب افتد
زپہلو دل برآرید از پس مرگم کہ سے ترسم | طفیلِ ایں قیامت پارہ دوزخ در عذاب افتد
(ق)
ازیں بیتے کہ ہست از نوری خونیں نوا مخلص | چہ استجاب دارد شور اگر در شیخ و شناب افتد
بگورستانِ گبرانم سپارید از پس مردن | مسلمانے مباد از پہلوئے من در عذاب افتد

راجہ انند رام مخلص لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۱۵۲ ہجری میں ہم یاران دیرینہ مانند پیام اور آرزو یار اور ثابت اور دیوانہ وغیرہ مزار فائض الانوار حضرت قطب الاقطاب خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے واپس چلے آرہے تھے برسات کا مہینہ تھا چاروں طرف سڑک کے سبزہ خود رَو عجب بہار دے رہا تھا پھوہیاں پہار برس رہی تھی یارانِ صادق اور دوستانِ موافق خوش طبعیاں کرتے فی البدیہہ اشعار کہتے قدرتی بہار کی سیر کرتے رتھوں میں بیٹھے چلے آرہے تھے کہ بہار کے قافیہ پر آرزو بولے ؎

چو کانِ لعل بجوش است خونِ من دایم
پئے جنوں بنود حاجتِ بہار مرا

پیام شیریں کلام نے فرمایا ؎

ترا بجون گل و نالہ باغباں سوگند
ز آشیاں مکن آوارہ در بہار مرا

بہت دیر تک سب اس شعر کی داد دیتے رہے جب میرا نمبر آیا تو میں نے کہا ؎

بہرزہ نیست دلم را شکایت از صیاد
قفس گرفتہ بگل آخر بہار مرا

جب ہم مولانا ناصر علی مغفور کے مزار پر پہونچے تو سب نے فاتحہ پڑھکر پھر شعر خوانی شروع کی سراج الدین علی خاں آرزو مزار کی طرف منہ کر کے بولے کہ یہ بزرگ اپنے زمانے کے ہنگامہ آرائے شور محشر تھے اگر اہل دل تھے تو اب بھی کچھ اپنی کرامت دکھائیں اور ضیافت طبع فرمائیں کیونکہ " ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق " ابھی یہ فقرہ ختم ہوا تھا کہ مولانا کے مزار پر جو سری کے درخت پر ایک کویل اس خوش آوازی اور درد ناکی سے کوکی کہ ہم لوگوں کے دلوں پر اثر ہوا اور سب حاضرین کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور دو چار کو وجد ہو گیا اور آرزو تو بیہوش ہو کر گر پڑے مولانا کا یہ مطلع بے اختیار پکار کر پڑھا ؎

خاک گردیدیم و میر قصد ہنوز افغان ما
خم شکستہ اما نمی ریزد سے جوشان ما

اس شعر نے تو اور بھی آگ پھونکدی اور قیامت صغریٰ قائم کردی ایک دوسرے کو لپٹ لپٹ کے روتے تھے اور مزار کے گرد پھرتے تھے بڑی دیر تک مولانا ناصر علی مغفور کے اس فیضان نے ہم سب کو مست و بیخود بنائے رکھا للّٰہ در من قال ؎

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود

———∘∘∘———

انتخاب بیاض جناب ب۔ن چکبست لکھنوی

فیضی

درون خانہ من یار بے حجاب آمد	بگیر پردہ کہ در خانہ آفتاب آمد

شاہ جہانگیر

شبنم مگو کہ بر ورقِ گل فتادہ است	کیں قطرۂ از دیدۂ بلبل فتادہ است

مرزا لاہوری

قدم بروں ننہد ماہِ من ز منزلِ خویش	بود چو صورتِ آئینہ زیبِ محفلِ خویش

محمد خاں قدسی

طبعم ز بادہ چوں گل سیراب روشن است	آئینۂ من است کہ از آب روشن است

ملّا ذہنی

ساقی دمید صبح قدح پر شراب کن	از روے گرم خود بطرے را کباب کن

مشتاق لکھنوی

گیا ہے حسن لیکن رنگ ہے رخسارِ جاناں پر	ابھی باقی ہے کچھ کچھ ہوئے پروا گلستاں پر

اشرف لکھنوی

حال کچھ پوچھ نہ ساقی سرِ محفل میرا	شیشہ کیا ٹوٹ گیا ٹوٹ گیا دل میرا

حکیم لکھنوی

حشر میں کوئی جو سنتا ستمِ دستِ جنوں	پہلے فریاد جو کرتا وہ گریباں ہوتا

فقط

مارگیٹ

اگست کا مہینہ لندن کے لئے زمانۂ راحت ہے۔ رفتہ رفتہ اس عظیم الشان شہر کی چل پل میں ایک خاص فرق محسوس ہونے لگتا ہے اور خصوصاً اس سال جبکہ خاص طور سے گرمی کے ایام زیادہ سخت ہیں اور تمازت آفتاب بعض دن اچھی خاصی ہندوستان کی گرمی کا مزا پیدا کر دیتی ہے اخبارات نے گرمی کی چیخ پکار سے کالم کے کالم بھر دئے ہیں کیونکہ ۹۰ درجے کی گرمی یہاں بہت زیادہ خیال کیجاتی ہے۔

تجارت پیشہ۔ مزدور۔ امیر و غریب ہر ایک کے لئے یہ زمانہ سواحل پر کچھ دن بسر کرنیکا ہے کسی کو ایک ہفتہ ملا ہے کوئی دو ہفتے کے لئے جا رہا ہے۔ بعض خوش نصیب مہینے دو مہینے کے لئے لندن کو خیرباد کہہ رہے ہیں مگر اس قسم کے لوگ زیادہ تر امرا اور متمول لوگ ہیں جنکے لئے وقت اور روپیہ کی کوئی کمی نہیں۔

انگلستان کے سواحل پر بکثرت چھوٹے چھوٹے شہر آباد ہیں۔ ان کی آب و ہوا ایک دوسرے سے مختلف ہے کیونکہ مختلف رخوں پر ایک دوسرے سے بالکل جدا جدا واقع ہیں سواحل جنوبی میں مارگیٹ کی آب و ہوا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بہت سے مقامات پر فوقیت رکھتی ہے کیونکہ یہاں کی چٹانوں میں آیوڈین مخلوط ہے جو ہوا کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ مقام سوسائٹی کے کسی خاص طبقے کے لئے مخصوص نہیں ہے کیونکہ یہاں ہر درجے کے لوگ نظر آتے ہیں۔ نصف حصے میں لندن کے ایسٹ اینڈ کے نہایت خراب اور رذیل قسم کے لوگ نظر آئینگے اور دوسری جانب خوبصورت ہوٹلوں اور عمدہ مکانات میں اعلیٰ اور اوسط درجے کی سوسائٹی کے لوگ یہاں کی مفید و صحت بخش ہوا سے لطف اٹھاتے ہونگے۔ کوئی شہر ہندوستان میں ایسا نہیں جس سے یہاں کے سواحل کو تشبیہ دیجائے۔ بمبئی سمندر پر واقع ہے لیکن وہاں ہوا میں سستی اور گرمی بہت ہے اسلئے صحت کے لئے وہ بالکل مفید نہیں۔

مارگیٹ کا ساحل نہایت اونچی اور بلند چٹانوں پر واقع ہے اور ایسی جان بخش و روح پرور
ہوا ہر وقت آتی ہے کہ دلوں میں سرور اور دماغ میں سکون معلوم ہوتا ہے ایک اجنبی کے
لئے یہاں انگریزی لائف کے ایسے عمدہ سین پیش نظر ہوتے ہیں کہ وہ کبھی انہیں بھول نہیں
سکتا۔ کسی شخص کو کام کاج سے کچھ سروکار نہیں۔ یہاں وہ لطف اٹھانے کے لئے آیا ہے
اسلئے خوب بے فکری کے ساتھ اس زمانہ بیکاری کو صرف کرتا ہے کہ بادی النظر میں معلوم
ہوتا ہے کہ کام کاج کا کبھی یہ عادی نہوگا مگر انگلش کیرکٹر کی یہی ایک خصوصیت ہے کہ جب
کام کرنے پڑتے ہیں تو جان و دل سے اس میں منہمک رہتے ہیں اور چھٹی کے زمانے میں
ایسی انہماک کے ساتھ چھٹیاں منانے میں مشغول ہوتے ہیں کہ انکار قریب بھی نہیں پھٹکنے
پاتے وہ لوگ جنکا دماغ کاروبار کی محنت سے بالکل تھک جاتا ہے یہاں آکر بے فکری میں
کچھ دن گذار کر از سر نو تازہ ہو جاتے ہیں اور پھر اپنے مشاغل میں مصروف ہوتے ہیں۔ اگر
کوئی پوچھے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی تعطیل کے زمانوں کو کسطرح گذارتے ہیں۔ تو
اول تو وہاں انگلستان کے مقابلے میں دماغی محنت ایک شمہ برابر بھی نہیں کرتے جس
کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ دونوں مقامات کی آب و ہوا میں زمین آسمان کا فرق ہے گرمی سے
اور دماغی محنت سے بیر ہے اسلئے گرمی کا موسم تو ہندوستان میں یونہیں نکل گیا اب رہا جاڑا
تو اس میں جب محنت کرنے پر آتے ہیں تو ایک دم سے ایسے گرتے ہیں کہ تندرستی خاک
میں ملجاتی ہے اور دماغ قریب قریب ماؤف ہو جاتا ہے تعطیل کے ایام کو بھی کاروبار کی چپقلش
کے ساتھ گڑبڑ کرکے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ انکو اسکا مطلق احساس ہی نہیں کہ آئین حفظان
صحت کی کسطرح پابندی کرنی چاہیئے اور دماغ کو کام کاج کے جھگڑوں کے بعد آرام پہونچانا
کسقدر ضروری ہے۔ وہ لوہے کی کل نہیں ہے کہ برابر کام دیتی رہے۔ کلیں بھی اگر ان میں
تیل نڈالا جاوے تو رفتہ رفتہ گھسنی شروع ہو جاتی ہے۔ انسان کے دماغ کا تو کچھ ذکر نہیں
اور جن لوگونکو خدا نے ثروت دی ہے انکے لئے تو ہر روز تعطیل رہتی ہے مگر تعطیل کا مزا
سخت مشاغل اور مصروفیت کے بعد ہی محسوس ہوسکتا ہے انہیں بیکار پڑے پڑے کیا مزا
آتا ہوگا۔

ساحل مارگیٹ پر صبح کے وقت جبکہ سمندر کی موجیں پیچھے ہٹی رہتی ہیں ریت پر کرسیاں بچھا سے بکثرت لوگ نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں ہر جگہ خوشی سے اُچھلتے کودتے پھرتے ہیں کسی کے ہاتھ میں چھوٹا سا لکڑی کا پھاوڑا اور ایک بالٹی ہے۔ اسی سے وہ ریت کو کھود کھود کر کہیں قلعے بنا رہے ہیں۔ کہیں گھر تیار کر رہے ہیں اور ایک نہر اسکے آس پاس کھود رہے ہیں کہ اتنے میں آہستہ آہستہ سمندر کی موج آگے بڑھتی ہے اور انکی قلعے کی دیوار انکو توڑتی ہے۔ نہر انکو بھرتی ہے اور مکانوں کو برباد کرتی ہے اور وہ خوش ہوتے ہیں۔

یہاں کنارے پر نہانے کے لئے سفید بند گاڑیاں کھڑی رہتی ہیں جس جگہ پانی کی گہرائی نہانے کے قابل معلوم ہوتی ہے وہاں انکو گھوڑے سے کھینچکر کھڑا کر دیتے ہیں اور لوگ دوسری گاڑیوں میں ٹھیکر ان میں داخل ہوکر اپنے کپڑے بدلتے ہیں اور سمندر کے پانی میں نہاتے ہیں۔ کنارے کے قریب ریت پر ایک خوبصورت تختے کا پل بہت لمبا بنا ہوا ہے اُسپر بکثرت آرام کرسیاں پڑی ہیں اور لوگ بیٹھے ہوئے نہانے والوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں بہت سے لوگ پانی میں تیر رہے ہیں اور اپنی شناوری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ ایک جگہ ایک تختہ لگا ہوا ہے جسپر کود کر لوگ اونچے مقام سے غوطے لگا رہے ہیں۔ مردوں عورتوں اور بچوں کا اسقدر ہجوم ہے کہ تمام کنارا بھرا ہوا ہے اور پانی میں کھوپڑیاں ہی کھوپڑیاں نظر آتی ہیں۔ سہ پہر کے وقت کنارے کے اوپر کی چٹانوں پر جو بہت اونچی ہیں اور جہاں خوبصورت باغات۔ سبزہ زار اور دلفریب پھولوں کی روشیں بنی ہوئی ہیں۔ لوگ ٹھیکر یا تو جنٹلمینسنتے ہیں یا اُس خوبصورت مقام پر جہاں بینڈ بجتا ہے کوئی عورت نغمہ سرائی کرتی ہوتی ہے اور اسکے طائفے کے بھانڈ اپنے لطیفوں سے لوگوں کو خوش کرتے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے مکان کے برآمدوں میں کرسیاں بچھائے وہیں سے سمندر کی خوشگوار ہوا کے مزے لے رہے ہیں اور نیچے اُتر کر آنا نہیں چاہتے۔

یہ تو ذرا معقول اور عمدہ صحبتوں کا ذکر ہے لیکن جو حصہ نامعقولوں سے بھرا ہوا ہے وہاں کچھ اور ہی تماشا نظر آتا ہے۔ ریت پر بکثرت لوگ بیٹھے ہیں اور ایک طرف حبشیوں کا طائفہ جسے نگر کہتے ہیں گا بجا رہا ہے اس سوانگ کے گرد بکثرت لوگوں کا ہجوم ہے۔ گانے

کے اختتام پر چند کتابیں اُن بچونکو بطور انعام کے دیجاتی ہیں جنہوں سنے بہت اچھا گایا یا ناچا ہے۔ یہ بچے تماشائیونکے ہوتے ہیں۔ لیکن بڑے بیباک اور بے تکلف۔ ہر جگہ شہر کو نپر مارے مارے پھرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ بلکہ جوان تک اسطرح تن تنہا ماری ماری پھرتی ہیں کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ ایک مقام پر ایک بہت بڑا ہال بنا ہوا ہے جہاں کے تماشے نہایت عام لوگونکے لئے ہوتے ہیں اور بعد تماشے کے وہاں ناچ ہوتا ہے۔ اس ناچ میں عجیب کیفیت نظر آتی ہے کہ نوجوان آدمی بے دھڑک نوجوان لڑکیوں سے جنسے کبھی کی جان پہچان ہی نہیں ہوتی ناچنے کی درخواست کرتے ہیں اور وہ بے تکلف راضی ہو جاتی ہیں۔ یہ بڑی بیہودگی معلوم ہوتی ہے مگر میرا خیال ہے کہ جتنے حضرات اس ہال میں نظر آتے ہیں انکا مرتبہ انگریزی سوسائٹی میں ہمارے ہاں کے کنجڑوں۔ دھوبیوں اور قصابوں سے بڑھکر نہیں ہے۔ ان کنجڑوں قصابونکو بھی اگر کوئی اجنبی اچھے کپڑوں میں دیکھے تو بالکل پہچان نہ سکے اور اس موقعہ پر تو سب ایسے عمدہ کپڑے اور سوٹ پہنکر آئے تھے کہ بلا گفتگو کئے انہیں تمیز کرنا مشکل تھا۔ یہ لوگ سب پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور قومی فرائض۔ ملکی حقوق سے واقف اور پولٹیکل معاملات سے دلچسپی رکھنے والے ہوتے ہیں اور فرصت کے وقت اخبار اور پینی ناولس پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے قصابونکا انسے کیا مقابلہ۔ مگر میں ایک لحاظ سے اپنے ہاں کے ادنےٰ درجے کے آدمی کو ان سب پر فوقیت دیتا ہوں۔ بجاے اسکے کہ وہ ایسی بیہودگی اور شراب خوری میں مبتلا ہو جس میں یہانکے ادنی درجے کے لوگ ڈوبے ہوے ہیں اور جس سے انکے خاندانوں پر مصیبت چھائی ہوئی ہے اور صدہا لندن کی ناپاک گلیوں میں بھوکے مر رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ وہ اپنی جہالت اور تاریکی کی حالت میں پڑا رہے اور چین و آرام سے دال دلیا کھا کر اپنی زندگی تندرستی کے ساتھ بسر کرے۔

شام کے وقت لوگونکا ہجوم ایک خاص مقام پر ہوتا ہے جسے "جیٹی" کہتے ہیں یہ ایک نہایت ہی خوبصورت عمارت، لکڑی کی بنی ہوئی۔ کنارے سے دور سمندر میں واقع ہے اور چاروں طرف سے پانی سے گھری ہوئی ہے۔ ایک خوشنما پل پر سے لوگ آتے

جاتے ہیں۔ یہ عمارت بہشت ہیل ہے۔ یہاں ہر طرف سے ہوا آتی ہے اور اسقدر ٹھنڈا اور خوشگوار مقام ہے کہ اگر ہندوستان میں ہوتا تو گرمیوں میں بہشت کا نمونہ سمجھا جاتا لکڑی کی دوکانیں چاروں طرف بنی ہوئی ہیں اور بینڈ اور تماشے ہر وقت ہوتے رہتے ہیں۔ ایک عجب دھما چوکڑی مچی رہتی ہے آدمیوں کی کثرت ہوتی ہے اور رات گئے تک لوگ اس مقام کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ چاندنی رات میں اس جگہ ٹہلنا۔ تماشے دیکھنا۔ بینڈ سننا۔ ایسا پر لطف ہے کہ کبھی کوئی اسکا مزا نہیں بھول سکتا۔

مارگیٹ سے اکثر لوگ برقی ٹرام۔ یا کوچ پر بیٹھکر یا پیدل مختلف مقامات کی سیر کو جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے قریب قریب واقع ہیں۔ مثلاً براڈسٹیرز۔ رمسگیٹ۔ وسٹگیٹ وغیرہ۔ میں ایک مرتبہ کوچ میں بیٹھکر کنٹربری گیا تھا۔ یہ مقام یہاں سے بارہ میل پر واقع ہے۔ مگر بہت سے گانوں اور قریے راستے میں پڑتے ہیں۔ ہر جگہ ایک اِن (سرائے) ضرور ہوتی ہے۔ یہ اِن ایک سہ منزلہ مکان ہوتا ہے جسکے اوپر کی دو منزلیں سونے اور رہنے کے لئے ہوتی ہیں اور نیچے شراب اور دیگر اشیا کی دوکانیں ہوتی ہیں۔ یہاں لوگ اُتر کر چاء وغیرہ پیتے ہیں۔ ایک جگہ ہمیں گاؤں کی بہت سی چھوٹی چھوٹی لڑکیاں گاتی ہوئی ملیں جنہیں کچھ کچھ سب نے دیا۔

یہاں کے گاؤں نہایت ستھرے اور خوبصورت ہوتے ہیں۔ غریب سے غریب کسان کے بھی کمرے۔ میز کرسی۔ صاف بچھونا اور کھڑکیوں میں دو ایک پردے لگے رہتے ہیں۔ ہر گاؤں میں ایک ڈیری ہوتی ہے جہاں مویشی نہایت اچھی طرح رکھے جاتے ہیں۔ یہاں بہت صفائی رہتی ہے اور ہر جگہ ایک سلیقہ اور انتظام پایا جاتا ہے۔ مرغیوں کے لئے علیٰحدہ جگہ مقرر ہوتی ہیں جہاں اُنکی پورے طور سے حفاظت کیجاتی ہے۔ کھیتی کی نہایت ہوشیاری کے ساتھ باقاعدہ طور پر خبر گیری کیجاتی ہے۔ لوہے کا ہل ہوتا ہے جسکے آگے دو پہیئے لگے ہوتے ہیں اور گھوڑا کھینچتا ہے۔ لوہے کی تیلیوں کی ایک گول کل ہوتی ہے جس سے کھیت صاف کئے جاتے ہیں اور گھاس اور تنکے وغیرہ دور کئے جاتے ہیں۔ ایک تیسری چیز لوہے کے رولر کی طرح ہوتی ہے جس سے کھیت کو ہموار کرتے ہیں۔

اس جگہ کی سبزی نہایت خوشنما تھی۔ طرح طرح کے رنگ کے کھیت بہت عمدہ نظر آتے تھے۔ درختوں کی کنج اور بعض جگہ اُنکی دور ویہ قطاریں بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں کہیں کہیں گھنے درختوں کے جنگل اور اُنکے بیچ میں کسی محل کی بلند چوٹی دکھائی دیتی تھی معلوم ہوا کہ ان میں اکثر مقامات بڑے بڑے امیروں کے محل ہیں اور ان درختوں کی کنج میں اُنکی شکارگاہیں بنی ہوئی ہیں۔ کنٹری ہوسس نہایت آرائش سے سجائے جاتے ہیں لیکن یہاں کی آرائش کا خیال ہی دوسرا ہے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سبزی جسقدر نیچرل ہوگی اتنی ہی بھلی معلوم ہوگی سلئے جہاں جہاں نیچر خست کرتی ہے۔ انسان اُس کمی کو مصنوعی پہاڑ آبشار اور نہریں بنا کر پورا کر دیتا ہے۔

ہمارا یہ سفر نہایت ہی لطف سے کٹا۔ اس وجہ سے کہ کوچمین نہایت بکی آدمی تھا اور ہر جگہ کے متعلق ایک نئی بات بیان کرنا چاہتا تھا۔

محمد لطافت حسین خاں۔ کلفٹن ڈیل۔ مارگیٹ

افسانہ اور دکن ریویو

ہمیں ایک دوست سے افسانہ و دکن ریویو بابت جون وجولائی سنہ ۱۹۰۲ء جو دونوں مہینوں کا ایک ہی جلد میں شائع ہوا ہے دیکھنے کے لئے ملگیا۔ ہمنے مختلف اشخاص سے اسکی تعریف سنی تھی اسلئے جلدی سے اُسکو کھول کر دیکھنا شروع کیا۔ اور سب سے پہلے فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالی جس میں مختلف حضرات کے نام معہ عنوان مضامین درج تھے۔ جسکے دوسرے صفحہ پر جناب نواب فخر الملک بہادر کی شبیہ طبع تھی اور مختصر الفاظ میں ناظرین پرچہ آپ سے متعارف کئے گئے تھے۔

مضامین میں سب سے پہلے ہز اکسیلنسی یمین السلطنت مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر دام اقبال

کے۔ جی۔ آئی۔ ای۔ وزیر اعظم دولتِ آصفیہ کا ایک مضمون بعنوان "دولت کیا چیز ہے" درج ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے موقت الشیوع رسالوں اور پرچوں میں ہندوستان میں غالباً یہی وہ پہلا پرچہ ہے جسے اس طرح کی عزت حاصل ہوئی ہے کہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں میں سے سب سے بڑی ریاست کے اولوالعزم صاحب الرأست۔ سربرآرائے وزارتِ عظمیٰ کے کلام لولو نظام نے اسے شرف بخشا۔ اللھم زد فزد۔ اسکے بعد اور انشا پردازوں کے عمدہ مضامین ہیں جن میں سے ہر ایک بمصداق۔ ع "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" بجائے خود اچھا ہے۔

لیکن جس امر نے ہمیں اس تحریر پر مجبور کیا وہ یہ دو مضامین ہیں جسے پروفیسر نقاد صاحب نے بعنوان "اصلاح اردوئے معلیٰ" حیدرآباد دکن سے۔ اور مولوی محمد احمد علی صاحب بی۔ اے۔ نے بنام نہاد نقاد اور اردوئے معلیٰ لکھنؤ سے تحریر فرمایا ہے۔ ان مضامین کو پڑھ لینے کے بعد حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) کیا فی نفسہ ایسے ہی مضامین کی ہمیں اور ہماری قوم کو ضرورت ہے؟

(۲) کیا اسی قسم کے مضامین قومی ضرورتوں کو پورا کرینگے؟

ان سوالات کا جواب اثبات میں دینے کے لئے افسوس ہے کہ کوئی خیر خواہِ قوم تیار نہیں ہوسکیگا۔ گو مباحثے اور مناظرے ہی کے ذریعے سے علمی مسائل کی تحقیقات ہوتی ہے لیکن کیا مباحثوں کا طرز اور پیرایۂ ادا اُس طرز سے جو ان مضامین کا ہے بہتر ممکن نہیں؟ بحالیکہ لینت اور نرم کلامی خصم کے قائل کرنے میں، سختی و درشت کلامی کی بہ نسبت زیادہ مفید اور موثر ثابت ہوئی ہے۔

ان مضامین کو پڑھ لینے کے بعد بے ساختہ زبان سے یہ نکل جاتا ہے کہ حکیم الاسلام شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے آج سے تقریباً ساڑھے چھ سو سال قبل اسی قسم کے مباحثوں کی نسبت اپنی جادو نگاری کے ذریعے سے اسطرح اشارہ کیا ہے۔؟

توگوئی دو مرغانِ شاطر بجنگ ؏

لم و لانسلم بہ پر واختند ؏

ہم ان مضامین کے بعض جملے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر نقاد صاحب نے بعض جگہ تحریر فرمایا ہے کہ" یہاں مولانا حسرت۔ نے کمال ابلہ فریبی سے کام لیا ہے۔"

" غرض ہمارے قابل شمس العلما اسیطرح لکھتے چلے گئے ہیں۔ پیچھے پھر کے نہیں دیکھتے کیونکہ ہمارے قصوں میں آیا ہے کہ پیچھے مڑکے دیکھا اور مرا۔"

" آپ جیسے حضرات اپنے اعتراضات کی ایسی وقعت سمجھنے لگے کہ جسے چاہا آسمان پر چڑھا دیا اور جسے چاہا تحت الثرےٰ کو پہونچا دیا۔ ہم تو بھائی حسرت ہی کو سمجھتے تھے کہ سر پہ ہے مگر لنکا میں جو ہے باون ہی گز کا ہے۔"

یہ تو پروفیسر نقاد صاحب کا طرزِ گفتگو ہے۔ اب مولوی احد علی صاحب۔ بی۔ اے کا طریقۂ مجاوبت ملاحظہ ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ!

" ہاں اتنا ہم ضرور کہینگے کہ نقاد صاحب پردہ نشین ناحق بنے۔ انہیں جو کچھ کہنا تھا مرد بنکے اور بے برقع و بے نقاب میدان میں آکے کہنا تھا۔"

" اب نقاد صاحب گریبان میں سر ڈالیں اور غور کریں کہ بے تحقیق کسی پر اعتراض جڑ دینکی خفت کیسی ہوتی ہے۔"

" نقاد صاحب کی لیاقت اور تحقیق کا حال اُنکے عمل اور پوچ لچر اعتراضات سے معلوم ہوچکا ہے ایسی حالت میں اُنسے کوئی کیوں زیادہ اُلجھے۔"

" جو شخص اس فقرے کو مہمل کہے وہ آپ مہمل ہے۔"

" نقاد صاحب کی لیاقت واجبی ہی واجبی ہے اور اعتراض کرنے پر مرتے ہیں۔"

" دیکھئے گا کیسی پوری سند ہے ذرا ابہت نہ چھپئے گا۔"

" نقاد صاحب کو اسکا خیال رکھنا چاہئے کہ ناچنے نکلے تو گھونگٹ کیسا۔ انکی پردہ نشینی سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خود اپنے اعتراضات کی لغویت کا دل سے یقین تھا اور اس وجہ سے انہیں ایسے لچر اعتراض اپنے نام سے چھپواتے شرم آئی۔"

یہ ہیں ان مضامین کے بعض وہ فقرے جنہوں نے ہمیں اس تحریر پر مجبور کیا۔

ہمیں خوف ہے کہ کسیدن یہ علمی پرچہ اس قسم کی تحریرات کے باعث اپنے اصلی مرکز سے

بحث کر کسی دوسری قسم کے پرچے کی صورت نہ اختیار کرلے۔

ہمیں اسکے لائق اڈیٹر مولوی ظفر علیخاں صاحب بی۔ اے سے یہ دوستانہ شکایت ہی نہیں ہے (گو اسوقت تک اپنی بدنصیبی سے ہم سے اُنسے ظاہری تعارف تک نہیں ہے) بلکہ اُنکی مشہور قابلیت اور قوت مُمیزہ سے قلبی طور پر گلہ ہے کہ کیوں اُنہوں نے ایسے رنج دہ مضامین کو اس میں جگہ دی۔ ہم پروفیسر نقاد صاحب بی سے واقف ہیں نہ مولوی احمد علیصاحب ہی سے شناسائی رکھتے ہیں۔ لیکن باوجود اسکے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان الفاظ نے اس بے تعلقی کے عالم میں ہمارے دل کو صدمہ پہونچایا۔ تو ہم نہیں خیال کر سکتے کہ خود اُن بزرگوار و پر جو اُسکے مخاطب ہیں ان ناگوار الفاظ کا اثر کیونکر نہ ہوا ہوگا اس قسم کے مضامین کی اشاعت عموماً اور خصوصاً اُس پرچے میں جس میں وزیر اعظم سلطنت کا مضمون بھی شائع ہوا ہو بہت ہی قابل افسوس ہے۔ کیونکہ یہ امر مقتضاے فطرت ہے کہ حکومت کی طرف ہر شخص عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور جب کوئی شخص مہاراجہ بہادر وزیر اعظم کے مضمون کے خیال سے اس پرچے کو دیکھیگا۔ اور ساتھ ہی اُسکے مضامین مذکورہ بالا بھی جو حدِ اعتدال سے گذرے ہوے ہیں نظر پڑیگی تو ہمکو افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ امر خود پرچے اور اُسکے لائق مدیر کے عمدہ اغراض علمی کے لئے ایک حد تک مُضر ہوگا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ فاضل اڈیٹر اور لائق مضامین نویس آیندہ سے اسکا لحاظ رکھینگے۔ اور اس تحریر میں بھی اگر کوئی امر اُنکے ناگوار خاطر ہو تو اُسکو معاف فرمائینگے۔ والعذر عند کرام الناس مقبول۔

محمد عبد العلی خاں

از حیدر آباد دکن

حضرت مولانا شاد مدظلہ

اس قادر الکلام و پرینہ سال موقر ذی علم صاحب ریاضت فخر روزگار بزرگ کی عمر اسوقت ماشاءاللہ ساٹھ برس کی ہے ظاہر ہے کہ ۴۵ - ۴۶ برس کے شب و روز کے ریاض نے آپکے کمال کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے - تیس برس اُدہر جب کہ آپ کی ریاضت صرف پندرہ - سولہ ہی سال کی تہی آپ کا آفتاب کمال جلوہ گر اور آپکے ذہن وقاد و طبع نقاد سے معاصرین کملا متاثر و معترف تہے - بیشتر مواقع میں آپ کو ضرورت تحریری مناظروں اور فی البدیہہ نظم کرنے کی بہی پیش آتی گئی ہے اگر وہ حالات اور مناظرے قلمبند کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے ایسے ہی بعض مواقع میں آپ کو کملائے عصر سے سیکڑوں محاوروں اور علمی معرکۃ الآرا ابواب کی تحقیق کی حاجت پڑی ہے اور جس کشادہ پیشانی اور توجہ کے ساتہ اُن کملائے معاصرین، مثل فخر علما و ادبا جناب مولانا مفتی سید محمد عباس مغفور مجتہد و جناب میر انیس و میر مونس و مرزا دبیر و حضرت اسیر و جناب منیر مرحومین وغیرہ وغیرہ نامی گرامی بزرگوں نے حضرت کے کلاموں اور جواب ہاے ایرادات اپنائے روزگار و دیگر مصنفاتِ قدیم کو ملاحظہ فرماکر جیسے جیسے بیان کئے ہیں اُسی زمانے سے واقف کار ونکو اُسکی صرف اطلاع ہی نہیں ہے بلکہ بیشتر سن رسیدہ حضرات کو جابجا سے اُن جوابونکے فقرے ابتک زبانی یاد ہیں - سنہ ۱۲۷۴ ہجری یا سنہ ۱۲۷۵ ہجری میں جبکہ آپ کی عمر بارہ تیرہ برس کی تہی لفظ گیت کے مذکر و مونث ہونے میں بہلکے بعض حضرات میں گفتگو ہوئی فریق مخالف اس لفظ کے مذکر ہونے کو نہ مانتے تہے تو حضرت نے ایک خط جناب مرزا دبیر مرحوم کی خدمت میں تحریر کیا جب کئی ہفتے تک جواب نہ آیا تو ایک منظوم خط جناب مرزا اسد اللہ خاں غالب مغفور کی خدمت میں بہی بہیجا حضرت غالب نے اُس نظم کو بہت پسند کرکے جو جواب لکہا تہا وہ اُس زمانے میں دست بدست پہرا کیا اور لوگونکو زبانی یاد ہوگیا وہ خط ذیل میں نقل کرتا ہوں -

اورنگ نشین فصاحت زیب وسادۂ بلاغت سلامت۔
نظم دلپسند یافتم دبر رسائی ذہن وقاد گرامی عشق عشق ہا گفتم اینکہ لفظ گیت بر وزن سیت ۔ معمول ہندوستان راازیں گم کردہ راہ حقیقت تحقیق فرمودی نہ آن چنانست کہ دیریں مہرکوش اسد اللہ مرزا وبیر سلمہ اللہ القدیر بپاسخ آں نگراید ..... وضیعان اینجا مذکرش خوانند۔ زیادہ عشق۔ خاکپائے اسد اللہ غالب مغلوب ''

غالباً اسی سے چند سال بعد اتفاقاً اس شہر کے نامی رئیس جناب منشی محمد امیر مرحوم نے اپنے صاحبزادے کے مکتب میں بہت کچھ سامان کیا محفلیں ہوئیں برات نکلی۔ اس سامان کو دیکھکر حضرت مولانا شاد بہت متاثر ہوئے اور اسی جلسے میں تین چار سو شعر کی ایک نظم لکھی اور سارے حالات اس تقریب کے اس میں بصراحت مذکور فرمائے صاحب تقریب نے اس نظم کو چھپواکر مشتہر کیا جب یہ نظم اُن صاحبوں کی نظر سے گذری جو حضرت مولانا شاد کے کمال کے ابتدا ہی سے سخت مخالف تھے (اگر اُن حاسدانہ کارروائیوں اور اعتراضوں کو مذکور کروں تو بہت طول ہو جائے گا ناظرین اتنا سمجھ لیں کہ سب قسم کی سخت مخالفتیں جیسی بیس سال تک علی التسلسل حضرت مولانا کے ساتھ ہوئی ہیں کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گذریں) رگ مخالفت جوش میں آئی اور اُن حضرات کو موقع ملگیا سیکڑوں بے سر وپا اعتراضوں کے ساتھ چند سات شعروں کے بارے میں یہ بھی شہرت دی کہ یہ اشعار شیخ امان علی مرحوم سحر کے مشہور قصیدے سے مسروق ہیں جب بعض اہل علم نے بھی ان اعتراضوں کا حال جناب مولانا سے بیان کیا تو حضرت نے اُن سب کے جواب میں ایک طویل نظم بطور قصیدہ لکھکر معاصرین کملا کی خدمت میں بھیجدی سب بزرگوں نے اُن جوابوں اور اُس نظم کو بجد پسند کر کے علیحدہ علیحدہ جواب تحریر کیے اور حضرت کو بہت کچھ سراہا وہ نظم بہت طویل ہے اسلئے یہاں درج نہ کر سکا ہاں بعض اشعار نظم مذکور کے مع اشعار سحر مرحوم و اشعار جواب کا تحریر کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہے ناظرین ملاحظے کے وقت اتنا ضرور لحاظ فرمائیں کہ یہ نظم ۳۲-۳۳ برس قبل کی ہے اور آج کی منظومات سے

لہ حضرت غالب کے خط ہذا کی نقل راقم سطور کے والد ماجد جناب حکیم سید احمد مغفور نے اسی زمانے میں اپنی کتاب پر لکھ رکھی تھی میں اسکی نقل یہاں درج کرتا ہوں ۱۲ منہ

اور اس سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔

الغرض اِن اعتراضوں کے جواب میں جو طولانی قطعہ لکھا ہے اُس میں سرقے کے بارے میں یوں فرماتے ہیں ؎

اب سُنیں گر نہ سُنی ہو سرقے کی تعریف
دیکھیں معیارِ سلول کو پڑھیں اہل نظر

سرقہ وہ ہے کہ قائل نے کیا ہو عمداً
یہ تعمّد بھی بہر طور ہو ثابت سب پر

پر یہ لازم ہے کہ ہوں لفظ و معانی اک سے
سننے والوں کو گماں ہو سرقے کا یکسر

دوسرے گر ایک میں اغراق ہو کب ہے سرقہ
ایک میں ہو جو غلو ہے سرقے سے باہر

ہوں بھی موصوف اگر ایک تو توصیفیں دو
وجہِ تشبیہ وہاں اور بیاں اور فقط ا

ہوں اگر علت و معلول بھی دونوں کے ا
یہ فصاحت سے برا ہو وہ یونہیں پوچ لچر

دونوں سے ایک کی ترکیب میں غیرت ہو
اس سے گزرید ہو مقصود تو اُس سے جو عمر

وہ بھی داخل نہیں ہوتا سرقے میں اصلا
اہل تحقیق نے لکھ دی ہیں مثالیں اکثر

اس قصیدے میں ہیں امثال و شواہد سے
آپ کھل جائیگا آئینہ صفت عالم پر

اب میں اشعار وہ لکھتا ہوں برائے تسکین
سرقہ کہتے ہیں جن شعروں کو بعض اہل ہنر

شیخ امان علی سحرؔ مرحوم ؎

ابرِ فیاں ہے دھواں دھار طبیعت اپنی
رات دن گلشنِ معنی میں برستے ہیں گہر

حضرت شادؔ فرماتے ہیں ؎

ابرِ نیساں ہے گہرزا ہے طبیعت میری
گو ہر نظم سے اک دم میں بہر دل سا آ گیا

سحرؔ ؎

کرسیِ عرش ہے ہر شعر کی کرسی واللہ
لوح دیوان کی لوح و قلم پیش نظر

حضرتِ شادؔ ؎

جامِ جمشید کا عالم ہے مرے دیواں میں
دونوں عالم کی ہے تصویر بیاں مدِّنظر

سحرؔ مرحوم ؎

برق کی طرح چمکتی ہیں ردیفیں ساری
قافئے بولتے ہیں صورتِ رعد آٹھ پہر

حضرت شاد ۳

کوئی مطلع شبِ تاریک میں اپنا جو پڑھوں	قافیے بول اٹھیں صورتِ مرغانِ سحر

محروم ۴

شعر سننے کو مرے سرو رواں آتے ہیں	ایک اعجاز میرا یہ ہے کہ چلتے ہیں شجر

حضرت شاد ۴

چمن آرائشوں کے دیکھ کے جاتے ہیں حواس	قدرتِ حق نظر آتی ہے کہ چلتے ہیں شجر

جواب از حضرت شاد مدظلہ

شعرِ اول میں دھواں دھار و گہر ریز ہے نظم	قابلِ دید ہے ایراد کیا ہے جس پر
چیز ہے ایک مگر دو صنعتیں ہیں مذکور	سرقہ اسکو کہے گا کوئی شاعر کیونکر
وہاں اگر گلشنِ معنی میں برستے ہیں گہر	گوہرِ نظم سے یہاں دم میں بروں سارا گہر
شعرِ ثانی میں جو ہے فرق نہیں پوشیدہ	دیکھئے غور سے ہو فارقِ بین جو نظر
کرسیٔ عرش وہاں شعر کی کرسی کو کہا	جامِ جمشید ہے دیوان یہاں مدِ نظر
لوحِ دیواں سے وہاں لوح و قلم ہے مراد	دونوں عالم کی ہے تصویر یہاں پیشِ نظر
شعرِ ثالث کو پڑھو غور سے دیکھو کیا ہے	حیف کس طرح کے ایراد کئے شعروں پر
قافیے بولتے ہیں رعد صفت ان میں یہاں	قافیے بول اٹھیں صورتِ مرغانِ سحر
شعرِ رابع کے مضامین الگ ہیں بالکل	مترصد ہیں یہیں سب متوجہ ہو کر
واں غرض سروِ رواں سے جو ہے قدِ معشوق	چمن آرائشوں کے یہاں یہ رہے مدِ نظر
وجہ تشبیہ وہاں اور یہاں اور خیال	وہاں چلتے ہیں شجر اور یہاں اور شجر
واں جو ذی روح چلے کون تکلف نکلا	غیر ذی روح کا چلنا ہے یہاں فضل تر
اسپہ تسکیں جو نہ ہو انکو مؤید ہیں مرے	کئی استادوں کے اشعار جو ہیں پیشِ نظر
ہاتفی سے نہ زیادہ ہوں نہ میں جامی سے	نہ تو عرفی کے برابر نہ ولی سے بہتر

آتشِ وقت نہیں اور نہ میں ناسخ عہد
ذوق و غالب ہوں میں اور ہوں خلیل او بیجر

انکے جب شعر دکھو کہہ دیتے ہیں کہنے والے
کہ یہ شعر اسنے کہا اُسکی غزل سے لیکر

تذکرے دیکھئے پڑھئے غزلیں ان سب کی
حال کھلجائیگا اُس دم پڑھتے کا یکسر

یوں جو پوچھو تو حسد کا نہیں عالم میں علاج
خود مسیحائے زمانہ بھی جو چاہتے آکر

شاد کیا فائدہ آئینہ ہے آئینہ نظم
کیوں نہیں دیکھتے اس بحث میں سائل کی نظر

شعر پڑھے کوئی مشتاق ہوں میں سننے کے
ان دنوں ہوتی ہے کسطرح سے وقت میں بسر

دل کے بہلانیکا چارا کوئی ہے بھی کہ نہیں
شب کو چین آتا ہے یا جاگ کے ہوتی ہے سحر

اسکے بعد مثالیں مذکور کی ہیں اور ایک غزل اسی طرح میں درج کی ہے۔

راقم
سید علی ہاشم۔ از پٹنہ

غزل اصطلاحی

از خان بہادر جناب مولانا سید علی محمد صاحب شاد۔ رئیس و آنریری مجسٹریٹ
عظیم آباد

صورتِ یار سے مقصود ہے قدرت اُسکی
دہن تنگ ہے کیا چیز حقیقت اُسکی

چشم و لب سے ہے قضا و قدر و حکم مراد
یہ بھی اک طرح کی گویا ہے مشیت اُسکی

مے سے عرفاں کہیں مقصود کہیں عشق مراد
مطلب اس بزم سے بزم ہے وحدت اُسکی

ساقیِ بزم علیؑ پیر مغاں پیغمبر
میکشی بیعت کی ہے گویا کہ اطاعت اُسکی

مدعا موشت سے اکثر ہے وصالِ محبوب
زندگی سے کہیں مطلوب ہے فرقت اُسکی

کاکلِ یار سے مقصود تعلق ہے کہیں
ملتی جلتی بہت اس سے ہے شباہت اُسکی

جسکو کہتے ہیں جنوں نام ہے اسکا عرفاں
عقل کے فہم میں کب آئیگی حالت اُسکی

واعظان ایسوں سے مطلوب ہیں حق کے عزیز
ظاہری بات پہ لیتے ہیں شریعت اُسکی

کہیں مستوں سے ہے مطلب عرفا و صلحا
وہی واقف ہیں کہ کیسی ہے عذوبت اُسکی

خاص معنی کے لئے خاص نہیں ہاں کوئی لفظ
جیسا آغاز ہے ویسی ہے رعایت اُسکی

لفظ کچھ اور ہے مطلوب یہاں ہے کچھ اور
دیکھنی چاہئے نقاد کو حالت اُسکی

استعارے تو ہیں پر بے ادبی کا ڈر ہے
کیونکہ اک طرح کی یہ بھی ہے عبادت اُسکی

شادِ اشعار میں جس شخص نے رکھی یہ مراد
کاش لگ جائے ٹھکانے کہیں محنت اُسکی

عنفوانِ شباب کی گذشتہ خود پرستیوں کی حسرت آلود یاد

حسرت! اے عنفوانِ برنائی
رخصت! اے کاروانِ رعنائی

اب وہ سودائے خط و خال کہاں
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ خود آرائی

گلِ رخساریوں میں پژمردہ
جیسے کلیاں چمن میں مرجھائی

نہ وہ لہجہ رہا نہ طرزِ مقال
نہ تکلّم نہ ہے وہ گویائی

نہ رہی وہ لبوں میں اگلی سی
شکّر افشانی و شکر خائی

نہ رہا اُنکا سلسلہ سے ہے!
ہم تھے جن گیسوؤں کے سودائی

ہو رہے ہیں سپید موئے سیاہ
صبح پیری ہے شام برنائی

مشکگوں اُف! وہ چاندسی صورت
جسپہ تھا ہمکو نازِ یکتائی

سلکِ دنداں کا جب خیال آیا
لب پہ روتی ہوئی ہنسی آئی

لطمۂ سیلِ عمرِ رفتہ میں
بہ گیا تختۂ شکیبائی

رحم! اے موجِ رعشۂ پیری
اپنی کشتی بھنور میں چکرائی

مدد! اے آنسوؤں کی طغیانی
آگ سوزِ دروں نے بھڑکائی

ق

دل کے داغوں کو۔ مرہم کافور
صبحِ پیری! نہ لے کے تو آئی

تجھکو او آسمانِ کج رفتار
نہ ہماری روش پسند آئی

ہم بہت سر اُٹھا کے چلتے تھے
تو نے آخر زمین دکھلائی

نہ رہا آہ! وہ حدیقۂ عیش
جس میں تھے محوِ نغمہ آرائی

کِھل کے مرجھا گئے وہ پھول افسوس
روح افزا تھی جن کی رعنائی

اب ہے اُجڑی پڑی وہ بزمِ نشاط
جس سے تھا لطفِ صحبت آرائی

اب وہ جلسے کہاں ہیں یاروں کے
ہم ہیں اور آہ! کنجِ تنہائی

وہ شبِ ماہ و بزمِ رقص و سرود
مطرب و ارغنون و شہنائی

سبزہ و باغ و ساقی و معشوق
شیشہ و جام و بادہ و پیمائی

گرمیوں کی وہ چاندنی راتیں
نیلا نیلا وہ چرخِ مینائی

دن مرادوں کے سن جوانی کا
کچھ تڑپ دل میں کچھ شکیبائی

شب کو باغوں میں غنچہ اجاب
سرو و شمشاد کی صف آرائی

آہ! وہ ننھی ننھی کلیوں میں
کسی کم سن حسیں کی رعنائی

پتے پتے میں حسن کا عالم
بوٹے بوٹے میں شانِ برنائی

پانی کی ہلکی ہلکی موجوں میں
دل کا اندازِ ناشکیبائی

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں
لبِ جاں بخش کی مسیحائی

نہ رہے وہ شباب کے جلسے
حسرت! اے ذوقِ محفل آرائی

روئیں کس کس کو۔ کس کو یاد کریں
اُف! وہ ہنگامۂ خود آرائی

تلوے گھائل ہیں۔ پنڈلیاں کمزور
نہ رہی تابِ گام فرسائی

ضعفِ پیری نے ہے بنا رکھا
گھر میں پابندِ قیدِ تنہائی

ہائے! وہ دن بھی تھے قیامت کے
چال میں جب تھی محشر آرائی

ہمکو۔ اسے تازہ واردانِ شباب
کیا دکھاتے ہو شانِ برنائی

اس مرقع میں ہے صورتِ تصویر
ہم بھی تھے نقشِ نازِ یکتائی

لب میں اعجاز آنکھ میں جادو
قد میں شوخی تھی۔ خند میں زیبائی

چوڑا سینہ۔ بھرے بھرے بازو
اے دریغا! وہ شانِ برنائی

کبھی ہم بھی جوانِ رعنا تھے
یوں نہ چہرے پہ تھی خزاں چھائی

دن میں کپڑے بدلتے تھے سو بار
گرم تھی محفلِ خود آرائی

ہم نئے تھے۔ نئی ہماری وضع
نئی سج دہج نئی تھی رعنائی

دن کو یاروں سے رہتے تھے جلسے
شب کو پریوں سے صحبت آرائی

بنکے یوسف جو جاتے تھے بازار
جمع ہو جاتے تھے تماشائی

سر پہ کج تھی کلاہِ عجب و غرور
زیب بر تھی قبائے رعنائی

کبھی مہندی لگائی ہاتھوں میں
کی کبھی رخپہ غازہ آرائی

زعفرانی کبھی قبا بدلی
کبھی دستار سرخ رنگوائی

جوہی کے بھینے بھینے ہار و سنے
تھا معطر مشامِ رعنائی

دیکھتے تھے کبھی جو آئینہ
پہروں رہتے تھے ہم تماشائی

لیکن اگلی سی اب کہاں باتیں
نہ وہ صورت رہی نہ رعنائی

روٹھکر ہمسے چلدیا جو شباب
اُف! یہ کس کی ادا تجھے بھائی

تجھسے صبر و قرار تھا دل کو
تجھسے تھی روح کو شکیبائی

حیف! تیری نہ قدر کی ہم نے
کھوکے آئی سمجھ تو کیا آئی

سُرور جہان آبادی

از ابو الکمال سید محمد علی صاحب امید امیٹھوی از لکھنؤ

بھرے ہیں پائے رنگیں سر بسر خونِ تمنا سے
بگڑ آئے ہو کس ناکام کی بزم تماشا سے

قتیلِ ہجر ہو جاتے ہیں زندہ ایک ایما سے
مسیحا سیکھ لیں اعجاز اُس چشمِ فسوں زا سے

ہوا ہوں اک بتِ نا آشنا کا بندۂ الفت
سجے ہیں گوشِ ایماں حلقۂ زلفِ چلیپا سے

برا ہو نا اُمیدی کا کہ دل آخر لہو ہو کر
برنگِ اشکِ حسرت گر پڑا چشمِ تمنا سے

اُچٹ جاتی ہے شب کو نیند اک مستِ جوانی کی
مرے شوقِ قلق زا سے مری آہِ فلک سا سے

تمنا خیزیاں تیرے عتابِ لطف پرور کی
کوئی دیکھے مرے نیرنگِ اندازِ تماشا سے

گلہ کرتی ہے دیکھو غیر کی افسردہ طبعی کا
نگاہِ گرم کیا کہتی ہے چشمِ فتنہ آرا سے

بھلا دیکھوں تو کیونکر شوقِ وصل اُس شوخِ بدخو کا
نکلجاتا ہے میرے وسعت آبادِ تمنا سے

ہوا جاتا ہوں صرفِ ذوق آخر کچھ تو نسبت ہے
دلِ حسرت زدہ کو میرے اردوے معلےٰ سے

الگ بیگانہ وش وہ دیکھئے آپ بیٹھا ہے
میری جاں چشمِ بد دور آپ کی بزمِ تماشا سے

غزل جنابِ رئیسؔ اکبرآبادی

او کماندار یہ جاسوس ہے پیکاں تیرا
ڈھونڈتا پھرتا ہے ولمیں مرے ارماں تیرا

شکلِ سوفارِ لبِ زخم بھی ہنس پڑتے ہیں
گدگداتا ہے جو دل کو مرے پیکاں تیرا

پھر گئی ہائے چھری کس کے گلے پر قاتل
چُٹکیاں کہاتا ہے کچھ گوشۂ داماں تیرا

دہنِ زخم بھی مُنہہ پھٹ ہیں ہمارے قاتل
ہے اگر مُنہہ کا کڑا خنجرِ برّاں تیرا

ہم بھی ساتھ اپنے لئے خون میں سے ڈوبینگے
صاف کیا ہم سے نکل جائیگا داماں تیرا

کیا مزا حشر میں ہو داورِ محشر کے حضور
میں ہوں اور تو ہو مرا ہاتھ گریباں تیرا

ہے کیا اپنے کلیجے میں چھپا لی حسرت
کیوں مجھے مفت سے ٹمرتا ہے پیکاں تیرا

خضر کی عمر سے بڑھکر ہو تیری عمر دراز
بال بیکا نہوا اے زلفِ پریشاں تیرا

قیدِ ملبوس بھی کرتا نہیں آزاد پسند
تنگ ہے جامۂ ہستی سے بھی عریاں تیرا

حالتِ دل کی تہِ دل سے خبر لاتا ہے
اشک ہرکارہ ہے اے دیدۂ گریاں تیرا

میرے دل سا نہو ارماں بھرا دل کوئی
تو بھی آئے تو نکلتا نہیں ارماں تیرا

سادہ رو دیکھتے ہیں شوق سے ہر وقت زمیں
چاند سی شکلوں کو آئینہ ہے دیواں تیرا

غزل جناب سید علی سجاد صاحب سجاد عظیم آبادی

جابجا جو گوشۂ دامانِ قاتل چاک تھا
یادگارِ کشتگانِ غمزۂ بیباک تھا

وہ اُٹھے بھی تھے نہ خوابِ ناز سے جانا تو کیا
صبحِ محشر کی طرح میرا گریباں چاک تھا

بعد مردن بھی نہ حسرت صید ہونے کی گئی
خاک ہو کر میں غبارِ دامنِ فتراک تھا

آج شورِ نشۂ مے نے یہ کیا افسوں کیا
کُل نہ میں گستاخ تھا اتنا نہ وہ بیباک تھا

کچھ تو میری سخت جانی سے سمجھنا تھا انہیں
نیمچہ بھی تیز تھا اور ہاتھ بھی چالاک تھا

میرے ماتم کا بُرا ہو شرم سے میں گڑ گیا
کیا کیا ظالم نے آج ان کا گریباں چاک تھا

آپ نے دیکھا کہ ہم بے تیغ و خنجر مر گئے
لیجئے۔ اک جنبشِ مژگاں میں قصہ پاک تھا

ہوتی ہے سجاد ہر شے اصل کی جانب رجوع
خاک میں کیونکر نہ ملجاتا کہ آخر خاک تھا

غزل جناب مولوی حکیم عبدالہادی خانصاحب وفا رامپوری

تفرقہ حیرت و اندوہ کا یکسو ہو جائے
ہاں نگہ جوہرِ آئینۂ زانو ہو جائے

وحشت انگیز اگر چشمِ پریرو ہو جائے
فتنۂ حشر بھی گردِ رمِ آہو ہو جائے

وسعتِ حوصلہ و تنگیٔ فرصت ہے یہ
کاش دم لینے کی صورت کسی پہلو ہو جائے

دلِ افسردہ جو بر آئے تو دریا بنجائے
جوشِ امید سمٹ جائے تو آنسو ہو جائے

ان اشاروں سے نزاکت کا بگڑنا کیا ہے
پردۂ حشر میں اک جنبشِ ابرو ہو جائے

گرم بازاریِ آوازۂ محشر کیا ہے
لبِ خاموش دکھا دوں تو ابھی ہُو ہو جائے

اس سے مرتا ہوں کہ یہ لاگ لگاوٹ ہو گی
اس پہ جیتا ہوں کہ دشمن سے خفا تو ہو جائے

تجھ سے پابندِ نزاکت کا الجھنا مشکل
مجھ سا آزاد اسیرِ خمِ گیسو ہو جائے

شوق ہے حیلہ طلب رشک سے میں درگذرا
ہو وہی میرے لئے جس کے لئے تو ہو جائے

شوقِ تازہ نے ابھی رنگ جمایا کیا ہے
دیکھنا کشمکشِ ناز کی جب خو ہو جائے

لطف تمکینِ حیا یہ ہے کہ شوخی بجائے	رنگ جب ٹوٹ کے ملجائے تو پھر بو ہو جائے
اے وفا ہم ہیں اُسی عالمِ حیرت میں حباب	محوِ م چشمِ تصورِ شبِ گیسو ہو جائے

غزل حسرت بطرحِ مشاعرہ مارہرہ

مولوی سید علی احسن صاحب احسن تخلص تلمیذ رشید حضرت داغ دہلوی نے ۱۵ ستمبر کو مارہرے میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی تھی جس میں اس نواح کے تمام مشہور شعرا جمع ہوئے تھے۔ مصرعہ طرح یہ تھا " دنیا میں ہم رہے تو زمیں آسماں رہے "۔ مشاعرہ نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ حضرات مارہرہ میں سے مولوی مخدوم عالم صاحب آبؔ۔ احسنؔ، طلیقؔ، دلگیرؔ کی غزلیں خوب تھیں اور جہاں تک ہمیں یاد ہے قاضی عبد الصمد صاحب فصیحؔ شاگرد حضرت امیر مینائی کی غزل لاجواب تھی۔ حضرات علیگڈھ میں سے مولوی عبد الجلیل صاحب طوفانؔ ڈپٹی کلکٹر نے سہ غزلہ لکھا تھا جس میں ایک فارسی غزل اسی ردیف قافیے میں بڑی خوبی کیساتھ نکالی تھی۔ مولوی محمد اسمعیل صاحب ذبیحؔ نے ارباب مارہرہ کی شان میں ایک فارسی نظم بہت اچھی سنائی تھی۔ آپکی اردو اور فارسی غزلیں بھی قابل تعریف تھیں۔ تیاؔ برادر حضرت ریاض اور حضرت رسا جلیسری کی غزلیں بھی اچھی تھیں۔ بانیٔ مشاعرہ نے راقم حروف کو بھی یاد فرمایا تھا۔ مندرجہ ذیل نہایت عجلت میں ریل پر لکھی گئی تھی اسکی جانب مقطع میں اشارہ ہے۔ اور حضرات کی غزلیں گلدستہ فصیح الملک میں شائع ہونگی اسوقت انکا انتخاب ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے

میخوشیوں میں بےخبرِ دو جہاں رہے	ہم خوش رہے کہ بندۂ پیرِ مغاں رہے
اس بدگماں کو ترکِ وفا کا گماں رہے	محروم ہم، کہ مائلِ ضبطِ فغاں رہے
تا عمر ہم ستم زدۂ امتحاں رہے	اتنا ہی جب کسی سے کوئی بدگماں رہے
اے وائے آرزوئے عنادل کی سادگی	ممکن نہیں کہ جلوۂ گل جاوداں رہے
یارب ہمارے بعد بھی بزمِ شراب میں	ساقی کے دم سے دورِ مئے ارغواں رہے
یہ مقتضائے رابطۂ حسن و عشق تھا	ہم بدگماں ادھر وہ اُدھر بدگماں رہے
شگفتہ بہار کا دیکھا کبھی نہ رنگ	ہیہات کہ مبتلائے بلائے خزاں رہے
اس لیے چمن کو بھی اک دن اجڑ گیا	بلبل پہ گریۂ ستمِ باغباں رہے
[illegible] شبِ فراق کی مٹجائیں سختیاں	یونہیں اگر خیال ترا مہرباں رہے
بیکار عمرِ زہد میں ہم سے گئے بسر	یعنی یہی کہ بندۂ سود و زیاں رہے
محرومیٔ وفا سے نہ آیا یقینِ لطف	وہ مہرباں ہوئے بھی تو ہم بدگماں رہے
اُنسے شبِ وصال بھی کُھلکر نہ ہم ملے	تا صبح شکوہ ہائے جفا درمیاں رہے

دلچسپ کسقدر ہے تمام افسانۂ وفا	جب تک ہوا بیان وہ محوِ بیاں رہے	رہنا تھا تا انکا ہو کے رہے ہو عزیزِ خلق	ہم کیا ہیں [illegible] جہاں [illegible]
خاموشیوں پہ میری اک حیرت نقیب ہے	اُس پر جفا کو صبر و سکوں کے گماں ہے	حسرت رواروی میں بھی تھا یہ لحاظ	اشعار میں نسیم کا رنگ [illegible]